خیابانِ اردو

بارھویں جماعت کے لیے اردو کی معاون درسی کتاب

© NCERT
not to be republished

© NCERT
not to be republished

خیابانِ اردو

بارھویں جماعت کے لیے اردو کی معاون درسی کتاب

5258

विद्यया ऽमृतमश्नुते

एन सी ई आर टी
NCERT

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ
NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

© NCERT not to be republished

5258- KHAYABAN-E-URDU
Supplementary Reader for Class XII

ISBN 81-7450-689-6

پہلا ایڈیشن
فروری **2007** پھالگن **1928**

دیگر طباعت
دسمبر 2014 پوش 1936
جنوری 2018 ماگھ 1939
مارچ 2019 پھالگن 1940
جولائی 2020 شراون 1942
نومبر 2021 کارتک 1943

PD 1+0.5T SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، 2007

جُملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جا رہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کر کے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جا سکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جا سکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظر ثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چپکی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصور ہوگی اور ناقابل قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
سری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلور - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکتہ - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن	:	انوپ کمار راجپوت
چیف ایڈیٹر	:	شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر	:	ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر	:	وپن دیوان
ایڈیٹر	:	سید پرویز احمد
پروڈکشن آفیسر	:	عبدالنعیم

سرورق اور آرٹ
اروپ گپتا

قیمت : ₹120.00

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے شری وِرنداون گرافکس پرائیویٹ لمیٹڈ، E-34 سیکٹر 7، نوئیڈا - 201301 میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

not to be republished © NCERT

پیش لفظ

’قومی درسیات کا خاکہ — 2005‘ میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکول کی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور ’تعلیم کے طفل مرکوز نظام‘ کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سبھی اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہوکر، نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوّزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا پابند نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچیلا پن اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی تا کہ مطلوبہ ایام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور اندازِ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ

© NCERT not to be republished

درسی کتاب سوچنے اورمحسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروپوں میں بحث ومباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔کونسل زبانوں کی مشاورتی گروپ کے چیئر مین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کے بھی احسان مند ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پرفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تا کہ کتاب کو مزید نظر ثانی کے بعد اور زیادہ کار آمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی | ڈائریکٹر
دسمبر 2006 | نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

© NCERT not to be republished

اس کتاب کے بارے میں

بارھویں کلاس کے طلبا کے لیے یہ معاون درسی کتاب نصابی کتابوں سے ایک الگ مقصد رکھتی ہے۔ یہ کتاب ان کی تعلیمی استعداد میں اضافے سے زیادہ، ان کے ادبی ذوق کی تربیت اور ادب کے ان نادیدہ جہانوں سے انھیں روشناس کرانے کے لیے مرتّب کی گئی ہے، جو رسمی نصابات کے تقاضوں کی تکمیل کے دوران ان کی نگاہ سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ پہلی سے بارھویں جماعت تک زبان وادب کے طلبا ادب کی کچھ صنفوں سے براہ راست طور پر متعارف نہیں ہو پاتے۔ مثال کے طور پر، ناول اور اسٹیج ڈراما ان کی نصابی کتابوں میں یوں شامل نہیں کیا جاسکتا کہ اسے پڑھنے کے لیے خاصا وقت چاہیے لیکن ادب کا کوئی طالب علم مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، نظم، رباعی، افسانہ، سوانح، سفرنامہ، تنقید تو پڑھ لے اور براہ راست طریقے سے ناول یا ڈراما نہ پڑھ سکے تو کسی نہ کسی مرحلے پر اسے ایک کمی کا احساس ضرور ہوگا۔ اسی لیے، ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ استاد کی باقاعدہ مدد کے بغیر بھی طالب علم ان اصناف کے نمائندہ متن کا کچھ حصّہ پڑھ لے۔ اسی طرح اردو کے طلبا پریم چند سے لے کر دور حاضر تک کچھ نمائندہ افسانے تو پڑھ لیتے ہیں لیکن انھیں اس حقیقت سے آگاہی نہیں ہو پاتی کہ اردو میں مشرق ومغرب کی زبانوں سے تراجم کی ایک روایت بھی زندہ ہے۔ دوسری زبان سے افسانے، ناول، نظمیں، مضامین، اردو میں ترجمہ بھی کیے جاتے ہیں۔ اسی واقعے کے پیش نظر ہم نے تین کہانیوں کے ترجمے بھی اس کتاب میں شامل کردیے ہیں۔ یہاں پطرس کے مضمون کی شمولیت کا جواز یہ ہے کہ ایک تو اس مضمون کی حیثیت اردو کے مزاحیہ ادب کی روایت میں ایک سنگ میل کی ہے۔ دوسرے یہ کہ معاون کتاب میں کچھ تو ایسا متن بھی ہو جو طلبا کے شعور میں گدگدی پیدا کرسکے۔ یقین ہے کہ ہر مضمون کے مطالعے سے وہ محظوظ ہوں گے اور ان میں اس طرح کی مزید تخلیقات کے مطالعے کا شوق پیدا ہوگا۔

© NCERT not to be republished

اظہارِ تشکر

اس کتاب میں پریم چند کا ناول ''بیوہ'' کا انتخاب، آغا حشر کاشمیری کا ڈراما ''یہودی کی لڑکی'' کا انتخاب، ترجمہ شدہ کہانیوں میں چے خف کی کہانی ''کلرک کی موت''، ویکوم محمد بشیر کی ''جنم دن''، نرمل ورما کی ''جلتی جھاڑی'' اور پطرس بخاری کا انشائیہ ''مرحوم کی یاد میں'' شامل ہے۔کونسل ان سبھی کے وارثین کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں کاپی ایڈیٹر ہما خان، پروف ریڈر مسعود اظہر، ڈی ٹی پی آپریٹرس محمد وزیر عالم، فلاح الدین فلاحی، ساجد خلیل اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک نے پوری دل چسپی سے حصہ لیا ہے۔کونسل ان سبھی کی شکرگزار ہے۔

© NCERT not to be republished

کمیٹی برائے معاون درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمریٹس، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمریٹس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، سابق پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجیز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

خلیق انجم، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

سید حنیف احمد نقوی، پروفیسر (ریٹائرڈ)، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

شمس الحق عثمانی، پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

شمیم احمد، ٹی جی ٹی، کریسنٹ اسکول، دریا گنج، نئی دہلی

شہپر رسول، پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صادق، پروفیسر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر (ریٹائرڈ)، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

صفدر امام قادری، صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ

ظفر احمد صدیقی، پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

© NCERT not to be republished

عبدالحق، پروفیسر (ریٹائرڈ)، دہلی یونیورسٹی، دہلی

عتیق اللہ، پروفیسر (ریٹائرڈ)، دہلی یونیورسٹی، دہلی

قاضی افضال حسین، پروفیسر اور صدر، شعبۂ اردو، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قاضی جمال حسین، پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کنیز وارثی، پی جی ٹی (ریٹائرڈ) گورنمنٹ سینئر سیکنڈری اسکول، نور نگر، نئی دہلی

محمد شاہد حسین، پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

ممبر کوآرڈی نیٹر

محمد نعمان خاں، ریٹائرڈ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

ترتیب

پیش لفظ				*v*
اس کتاب کے بارے میں				*vii*
ناول				**01-44**
منشی پریم چند	بیوہ			02
ڈراما				**45-86**
آغا حشر کاشمیری	یہودی کی لڑکی			46
کہانیاں (ترجمے)				**87-115**
چے خف	کلرک کی موت	(روسی کہانی)		87
ویکوم محمد بشیر	جنم دن	(ملیالم کہانی)	مترجم ضیا الرحمٰن صدیقی	93
نرمل ورما	جلتی جھاڑی	(ہندی کہانی)	(تلخیص)	107
انشائیہ				**116-132**
پطرس بخاری	مرحوم کی یاد میں			117

© NCERT not to be republished

بھارت کا آئین

تمہید

ہم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک مقتدر، سماج وادی، غیر مذہبی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں۔

انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی

آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت

مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں

اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر 1949ء کو یہ آئین ذریعہ ہذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

1۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''مقتدر عوامی جمہوریہ'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

2۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''قوم کے اتحاد'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

© NCERT not to be republished

ناول

نثری اصناف میں ناول اس وقت دنیا کی مقبول ترین صنفوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ ناول دنیا بھر کی زبانوں میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ مختلف ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر ناول کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن زندگی ہی کی طرح ناول کی بھی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں جسے مکمل یا قطعی کہا جاسکے۔ پھر بھی ناول کا اطلاق سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ایسی طویل اور بھرپور کہانی پر کیا جاسکتا ہے جس میں عام زندگی کے حالات و واقعات، مسائل و معاملات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔

روایتی ناول کے عام اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور مرکزی خیال کو شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں پلاٹ اور کردار نگاری کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ علاوہ اس کے، ناول میں زندگی کے مشاہدے اور انسانوں کے نفسیاتی مطالعے سے بھی کچھ لکھنے والوں نے بہت کام لیا ہے۔ ہر ناول کسی نہ کسی نظریۂ حیات کا حامل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناول مصنّف کے نظریۂ حیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اردو زبان میں ناول نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ یہ دور دو تہذیبوں کے تصادم اور کشمکش کا دور تھا، جس پر بڑی شدّت کے ساتھ انگریزی ادب کے اثرات بھی پڑ رہے تھے۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مرزا محمد ہادی رسوا اردو کے اہم ترین ناول نگار کہے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو ناول نے بڑی ترقی کی۔ اس عہد کے ناول نگاروں میں پریم چند، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، قاضی عبدالستار، جیلانی بانو اور جوگندر پال وغیرہ اہم ہیں۔

ناول کی صنف نے مغربی ناول، خاص طور پر انگریزی اور روسی ناول سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ پچھلے کچھ برسوں میں قدیم ہندوستانی فکشن کے اسالیب سے بھی بعض لکھنے والوں نے بہت روشنی حاصل کی ہے۔ چنانچہ اردو کی پرانی داستانوں، کتھا سرت ساگر اور الف لیلہ کی روایت کا اثر بھی چند نئے ناول نگاروں کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

© NCERT not to be republished

منشی پریم چند

1880 تا 1936

پریم چند کی پیدائش بنارس کے ایک گاؤں لمہی میں ہوئی۔ اُن کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ کنبے کے لوگ نواب رائے بھی کہتے تھے۔ دادا گُرسہائے لال، پٹواری تھے اور والد عجائب لال ڈاک خانے میں منشی تھے۔ والدہ آنندی دیوی کے مائیکے کے لوگ بھی تعلیم یافتہ تھے۔

پریم چند کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد 1899 میں بنارس کے قریب چنار گڑھ کے ایک مشن اسکول میں اسسٹینٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ اسی زمانے میں ادب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ چنار مشن اسکول کے بعد، جولائی 1900 میں بہرائچ کے ضلع اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ اسی سال ستمبر میں، فرسٹ ایڈیشنل ماسٹر کی حیثیت سے اُن کا تبادلہ پرتاپ گڑھ ہوگیا۔ 1902 میں تدریس کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کے لیے الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ہندی اور اردو اسپیشل ورنا کیولر کا امتحان بھی پاس کیا۔ ٹریننگ کے بعد 1904 میں الہ آباد کے ایک ماڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ 1905 میں کان پور کے ضلع اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ جون 1909 میں مہوبہ، ضلع ہمیر پور (یوپی) کے لیے تبادلہ ہوگیا اور تدریس کے بجائے اسکول کے معائنے کا کام سپرد کیا گیا۔ مہوبہ کے قیام کے دوران 1916 میں انٹرمیڈیٹ اور 1919 میں گورکھپور کے زمانۂ قیام میں الہ آباد یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ تحریکِ عدمِ تعاون کے دوران گورکھ پور کے ایک جلسہ میں مہاتما گاندھی کے ایما پر انھوں نے 1920 میں سرکاری نوکری چھوڑ کر تصنیف وتالیف کو ہی معاش کا ذریعہ بنالیا۔

پریم چند کو مضامین لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اُن کی پہلی تصنیف ایک ڈراما تھا جو انھوں نے تقریباً تیرہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ایک ماموں کا رومان۔ یہ ڈراما شائع نہیں ہوا۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے مضامین اور ایک ناول بنارس کے ہفتہ وار اخبار ''آوازِ خلق'' میں شائع ہوئے۔ ناول کا عنوان تھا: اسرارِ معابد۔ یہ اخبار کے اکتوبر 1903 سے فروری 1905 تک

© NCERT not to be republished

کے شمارے میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اس پر مصنف کا نام ''دھنپت رائے عرف نواب رائے الہ آبادی'' لکھا جاتا تھا۔ پریم چند کا دوسرا ناول ''ہم خُرما و ہم ثواب'' ہے جو غالباً 1906 میں کانپور سے منشی دیا نرائن نگم نے شائع کیا تھا۔ وہ ایک ماہانہ رسالہ ''زمانہ'' بھی شائع کرتے تھے، جس میں پریم چند کے بہت سے مضامین، تبصرے اور افسانے شائع ہوئے۔ 1910 تک اُن کی تصانیف نواب رائے کے نام سے چھپتی رہیں۔ پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' بھی نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن جب حکومت کومحسوس ہوا کہ اِن کہانیوں میں وطن سے محبت اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب، پڑھنے والوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کرسکتی ہے تو مجموعہ ضبط کرلیا گیا۔ مصنّف سے کہا گیا کہ وہ آئندہ جو کچھ لکھے وہ کلکٹر کو دکھا کر اور اجازت لے کر چھپنے کے لیے بھیجے۔ اِس پابندی کے بعد انھوں نے اپنا قلمی نام پریم چند رکھ لیا۔ رسالہ ''زمانہ'' کے دسمبر 1910 کے شمارے میں اُن کی کہانی ''بڑے گھر کی بیٹی'' شائع ہوئی۔

پریم چند کے ناول ''اسرار معابد'' اور ''سوزِ وطن'' میں شامل کہانیوں کا یہ پہلو بہت واضح ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کی برائیوں اور انگریزی حکومت کی چال بازیوں سے عوام کو آگاہ کیا۔ اس طرح وہ اپنے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ پریم چند کے اس ارادے کی وجہ ہندوستانی معاشرے میں پھیلا ہوا انتشار تھا۔

دیہات اور شہروں کی یہ حالت دیکھتے ہوئے ملک کے بڑے سیاسی رہنماؤں، خاص کر گاندھی جی کی طرح، پریم چند نے بھی محسوس کیا کہ اِس بھیانک بگاڑ کی جڑ غلامی کی مٹّی اور فضا کی وجہ سے مضبوط ہو رہی ہے۔ لہٰذا ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے بعد ہی یہاں کے غریب لوگ انسانوں کی طرح جی سکیں گے۔ اپنے اس احساس کو سیاسی لوگوں نے جدوجہدِ آزادی کا روپ دیا اور پریم چند نے اپنے اِس احساس کو تحریر میں ڈھال کر ناولوں اور افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔

پریم چند کی سوانح پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے جیسے جیسے دور دیکھے، انھیں کسی ذہین اور حسّاس شخص کی طرح اپنے دل و دماغ پر نقش کرلیا۔ ان پر غور کرنے کے بعد، یہ فیصلہ کیا کہ زندگی کی ان سچائیوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ناولوں، افسانوں اور مضامین سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے، پریم چند نے بہت سادہ، سلیس اور پُر اثر زبان کا ستعمال کیا۔ اُن کے قلم سے نکلی ہوئی باتیں، پڑھنے والے کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ روز مرّہ کی ہندی کے الفاظ بھی مناسب جگہوں پر استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے ناولوں اور افسانوں میں مقصد پرستی اور سماجی فلاح و بہبود کے احساس کے ساتھ ساتھ دل چسپ کردار اور مزاحیہ کردار بھی ہیں۔ پریم چند نے ان کے ذریعے زندگی کا خوش گوار پہلو پیش کیا ہے اور پڑھنے والوں پر واضح کیا ہے کہ آدمی سخت سے سخت حالات میں بھی، زندگی

سے جی لگانے اور دکھوں کو برداشت کرنے کے پہلو نکال ہی لیتا ہے۔

پریم چند کے ناولوں کا ماحول اور اُن کے کردار زیادہ تر دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند بھی، گاندھی جی اور ٹیگور وغیرہ کی طرح، اِس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستان کی اصل آبادی گاؤں میں بستی ہے اور گاؤں کے باشندوں کی سادگی اور معصومیت ہندوستانی معاشرے کی روح کا ایک ناگزیر جزو ہے۔

آپ نے اپنی پچھلی جماعتوں میں داستان اور افسانے پڑھے ہیں۔انھیں پڑھتے ہوئے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ داستان کا مصنف کردار یا واقعے کا بیان کئی زاویے اختیار کرتا ہے اور بہت تفصیل سے کام لیتا ہے۔ افسانے کا مصنّف، داستان لکھنے والے کے مقابلے میں، بہت اختصار کے ساتھ اور اشاروں کنایوں میں اپنی بات کہتا ہے۔ اِن اشاروں کنایوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے پڑھنے والے کو بہت چوکنّا رہنا پڑتا ہے۔ اگر اُس کی نظر سے کوئی فقرہ یا لفظ چوک جائے تو افسانے کے معنی خبط ہو سکتے ہیں۔ یہ صورت ناول میں نہیں ہوتی کیوں کہ اس میں کردار اور واقعات اکثر پورے پھیلاؤ کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔

ناول ''بیوہ'' کے آغاز میں دان ناتھ اور امرت رائے کی باتوں پر غور کیجیے، تو اندازہ ہوجائے گا کہ پریم چند نے تین چار صفحات میں ہی وہ خیال اپنے پڑھنے والوں پر اچھی طرح واضح کردیا ہے، جس پر ناول کی تعمیر ہوئی ہے۔

آپ کی اِس کتاب میں ناول ''بیوہ'' کے ابتدائی نو باب شامل ہیں تاکہ آپ اِس صنفِ ادب سے بخوبی متعارف ہوسکیں۔ پریم چند کا ناول بہت مختصر ہے، یعنی صرف 182 صفحات کا۔ یہ چند صفحات پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ پریم چند کتنے دردمند دل کے مالک تھے۔ اُن کی یہ دردمندی اور انسان دوستی اُن کے تمام ناولوں میں مرکزی قوّت کا درجہ رکھتی ہے۔

پریم چند نے افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی دیہات کے ساتھ ساتھ، شہر کے مسائل کا بیان کیا ہے۔ اُن کے زیادہ تر ناول ایسے ہیں کہ جو شہری اور دیہی زندگی میں بٹے ہوئے ہیں مگر ''گئودان'' اور ''بازارِ حسن'' میں شہر اور گاؤں یکجا ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل رکھے ہوئے آئینے بن گئے ہیں۔

ناول ''بیوہ'' پڑھنے سے پہلے، اگر یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ خود پریم چند نے بھی اپنی دوسری شادی ایک بال بیوہ شیورانی دیوی سے کی تھی تو آپ پریم چند کے کردار کے ایک اہم پہلو سے واقف ہو جائیں گے۔ پریم چند ادیب کے ساتھ ساتھ ایک سرگرم سماجی مصلح بھی تھے اور ادب کے ذریعے انھوں نے قومی اصلاح اور تعمیر کا بیڑا بھی اٹھایا تھا۔

بیوہ

کاشی کے آریہ مندر میں پنڈت امرناتھ کی تقریر ہو رہی ہے، ناظرین مسحور سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پروفیسر دان ناتھ نے آگے کھسک کر اپنے دوست بابو امرت رائے کے کان میں کہا ’’رٹی ہوئی تقریر ہے۔‘‘

امرت رائے اسپیچ سننے میں محو تھے۔ اس کا جواب نہ دیا۔

دان ناتھ نے پھر کہا ’’صاف رٹی ہوئی تقریر ہے۔ یہاں بیٹھنا فضول ہے، ٹینس کا وقت نکلا جا رہا ہے۔‘‘

امرت رائے نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ آخر دان ناتھ نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ’’بھئی میں تو جاتا ہوں۔‘‘

امرت رائے نے ان کی طرف بغیر دیکھے ہی کہا ’’جاؤ شوق سے۔‘‘

’’تم کب تک بیٹھے رہو گے؟‘‘

’’میں تو آخر تک تقریر سن کر آؤں گا۔‘‘

’’بالکل بغلول ہو۔ یہ آخر اس تقریر میں ہے کیا؟‘‘

''تو تم جاؤ۔ میں تمھیں جبراً روکتا تو نہیں۔''

''ابھی گھنٹوں بولے گا۔ رانڈ کا چرخہ ہے یا تقریر ہے۔''

''سننے بھی دو، بیکار بک بک کر رہے ہو۔ تمھیں جانا ہو تو جاؤ۔ میں تقریر ختم کر کے ہی اٹھوں گا۔''

''پچھتاؤ گے۔ آج پریما بھی کھیلنے آئے گی۔''

''تم اس سے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔''

''مجھے کیا غرض ہے کہ آپ کی طرف سے معافی مانگوں۔''

دان ناتھ آسانی سے گلا چھوڑنے والے آدمی نہ تھے۔ گھڑی نکال کر دیکھی، پہلو بدلا اور بے صبری کے انداز سے پھر امرت رائے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی توجہ تقریر کی طرف نہیں، مقرر کی ڈاڑھی کی طرف تھی۔ ڈاڑھی کی جنبش پیہم میں انھیں بڑا مزا آ رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کا مرض تھا۔ ایسا دلچسپ نظارہ دیکھ کر خاموش کیسے رہتے؟ امرت رائے کا ہاتھ دبا کر بولے ''آپ کی ڈاڑھی کتنی صفائی سے ہل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ نوچ کر رکھ دو۔''

امرت رائے نے مکدّر ہو کر کہا ''تم بڑے بدنصیب ہو کہ ایسی دل آویز اور پُر اثر تقریر کا لطف نہیں اُٹھا سکتے۔''

مقرّر نے کہا۔ ''میں آپ صاحبوں کے روبرو تقریر کرنے نہیں کھڑا ہوا ہوں۔''

دان ناتھ ۔ (آہستہ سے) ''اور کیا آپ گھاس کھودنے آئے ہیں۔''

مقرّر ۔ ''باتیں بہت ہو چکیں اب عمل کا موقع ہے۔''

دان ناتھ ۔ (آہستہ سے) ''جب آپ کی زبان آپ کے قابو میں رہے۔''

مقرر۔ ''جو اصحاب اپنی رفیق زندگی کا داغ اٹھا چکے ہیں وہ براہ کرم اپنے ہاتھ اٹھائیں۔''

دان ناتھ ۔ (دبی آواز سے) ''افوہ! یہاں تو آدھے سے زیادہ رنڈوے نکل آئے۔''

مقرر۔ ''جو اصحاب اس خیال سے متفق ہوں کہ رنڈووں کو کنواریوں سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے وہ براہِ کرم اپنے ہاتھ اٹھائیں۔''

صرف ایک ہاتھ اٹھتا ہے! یہ بابو امرت رائے کا ہاتھ ہے۔ اہل جلسہ ان کی طرف پُر سوال دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

دان ناتھ نے امرت رائے کے کان میں کہا ''یہ کیا بیہودہ حرکت ہے؟ ہاتھ نیچے کرو۔''

امرت رائے ۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس سے بہتر دوسرا معاشرتی اصول نہیں ہے۔''

مقرر نے امرت رائے کو ان کی اخلاقی جرأت پر مبارک باد دی۔ چند جملوں میں ناظرین کی پست ہمتی پر افسوس کیا اور بیٹھ گئے۔ جلسہ ختم ہو گیا۔

اہلِ جلسہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، دان ناتھ بھی باہر چلے آئے مگر امرت رائے ابھی تک محویت کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دان ناتھ نے ایک منٹ تک باہر کھڑے ہو کر انتظار کیا، تب اندر جا کر بولے ''ارے اب تو چلو گے یا یہیں ڈھئی دو گے؟''

امرت رائے نے چونک کر کہا ''ہاں ہاں چلو۔''

دونوں دوست آ کر موٹر میں بیٹھے، موٹر چل پڑی۔

دان ناتھ کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ پوچھا ''آج تمھیں یہ حماقت کیا سوجھی'' امرت رائے نے تمسخر کے انداز سے جواب دیا ''وہی سوجھی جو تمھیں سوجھی۔''

''پریما سنے گی تو کیا کہے گی؟''

''بے حد خوش ہوگی۔'' کم سے کم اسے خوش ہونا چاہیے۔ اپنے احباب کو فرض کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا؟''

دان ناتھ نے ملامت کی ''اجی جاؤ بھی، باتیں بناتے ہو۔ اسے تم سے کتنی محبت ہے یہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے، ابھی شادی نہیں ہوئی (حالانکہ تم خود اس کے ذمہ دار ہو) یہ درست ہے۔ لیکن سارا شہر جانتا ہے کہ وہ تمھاری منگیتر ہے سوچو اس کے اور تمھارے درمیان کتنی خط کتابت ہو چکی ہے۔ وہ دل میں تمھیں اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہے، ایسی نازنین تمھیں دنیا کے پردے پر نہیں ملے گی۔ یہ سمجھ لو کہ تمھاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اپنے ساتھ اس کی زندگی بھی خراب کر دو گے۔ فرض کے نام پر جو چاہو کرو مگر پریما کو دل سے نہیں نکال سکتے۔''

امرت رائے متانت سے بولے ''یہ سب میں خوب سمجھ رہا ہوں بھائی جان، لیکن میرا ضمیر کہہ رہا ہے کہ مجھے اس سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، پنڈت امرناتھ کی تقریر نے میری آنکھیں کھول دیں۔''

امرناتھ کا نام آتے ہی دان ناتھ نے ناک سکوڑ کر کہا۔

''کیا کہنا ہے واہ! اس نے رٹ کر ایک تقریر کر دی اور تم لٹو ہو گئے۔ یہ اچھا اصول ہے کہ جس کی پہلی بیوی مر چکی ہو وہ کسی کنواری لڑکی سے شادی نہ کرے۔''

© NCERT not to be republished

امرت رائے نے کہا ’’انصاف تو یہی کہتا ہے۔‘‘

دان ناتھ بولے ’’تو بس ایک تمھارے انصاف پر چلنے سے قوم کی نجات ہو جائے گی، تم تنہا کچھ نہیں کر سکتے، ہاں نکو بن سکتے ہو۔‘‘

امرت رائے نے پر زور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا ’’آدمی تنہا بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ تنہا آدمیوں نے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیے ہیں۔ دنیا کی صورت بدل دی ہے۔ افراد کی داستانِ عمل سے تاریخیں پُر ہیں۔ گوتم بدھ کون تھا؟ وہ تنہا حق کی تلاش میں نکلا تھا اور اس کے دورانِ حیات میں ہی آدھی دنیا اس کے قدموں پر سر جھکا چکی تھی، افراد کے نام سے قوموں کے نام روشن ہیں، قومیں تباہ ہو گئیں آج ان کا نشان بھی باقی نہیں، مگر مخصوص ہستیوں کے نام ابھی باقی ہیں۔ میں اکیلا کچھ نہ کر سکوں، یہ دوسری بات ہے۔ اکثر جماعتیں بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔ میرا خیال ہے کہ جماعتیں کبھی کچھ نہیں کر سکتیں، لیکن آدمی اکیلا کچھ نہیں کر سکتا، میں اس کلّیے کو کبھی تسلیم نہ کروں گا۔‘‘

دان ناتھ سہل پسند آدمی تھے۔ کسی اصول کے لیے تکلیف اٹھانا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ گیارہ بجے جاتے تھے۔ دو بجے لوٹ آتے تھے۔ باقی سارا وقت کتب بینی اور سیر و تفریح میں اڑا دیتے تھے۔

اس کے برعکس امرت رائے اصول پرور آدمی تھے اور بڑے دھن کے پکے۔ ایک بار کوئی فیصلہ کر کے اس سے منحرف نہ ہوتے تھے۔ پیشہ وکالت تھا مگر اس پیشے سے انہیں نفرت تھی۔ بنائے ہوئے مقدمے بھول کر بھی نہ لیتے تھے، لیکن جو مقدمہ لے لیتے اس کے لیے جان لڑا دیتے تھے۔ یہی سبب تھا، انہیں ناکامی کا صدمہ بہت کم اٹھانا پڑتا تھا۔ ان کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک لڑکا بھی پیدا ہوا لیکن زچہ اور بچّہ دونوں زچہ خانہ ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ امرت رائے کو اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب کبھی شادی نہ کروں گا لیکن جب بہن کی شادی ہو گئی اور والدین بھی ایک ہفتہ کے اندر ہیضے کے شکار ہو گئے تو سونا گھر پھاڑ کھانے لگا۔ دو سال سیر و سیاحت میں بسر کیے، لوٹے تو ہولی کے دن ان کے سُسر نے اس تقریب میں ان کی دعوت کی، وہ امرت رائے کے اطوار پر پہلے ہی سے فدا تھے۔ ان کی چھوٹی لڑکی پریما اب شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ اس کے لیے امرت رائے سے بہتر شوہر انھیں دوسرا نظر نہ آیا۔ دو سال قبل امرت رائے نے پریما کو دیکھا تھا۔ وہ شگفتہ کلی اب ایک شگفتہ پھول تھی جس کی نزاکت اور لطافت آنکھوں کو لبھاتی تھی۔ امرت رائے کا غم نصیب دل یہاں سے محبت کا اثر لے کر لوٹا۔ تب سے جب طبیعت گھبراتی سسرال چلے جاتے اور دو گھڑی ہنس بول کر چلے آتے۔ ایک دن ان کی ساس نے ان سے مطلب کی بات کہہ دی، امرت رائے تو پریما کے رنگ و بو پر پہلے ہی نثار تھے۔ اندھے کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔ شادی طے ہو گئی اسی

© NCERT not to be republished

مہینے شادی ہونے والی تھی کہ آج امرت رائے نے عام جلسے میں اس نئے اصول کو تسلیم کر کے اپنا ارادہ فسق کر دیا۔

دان ناتھ نے ان کی لمبی تقریر سن کر کہا ''تو تمھارا یہ قطعی فیصلہ ہے۔''

''بیشک۔''

''اور پریما کو جواب دو گے؟''

''اسے مجھ سے بہت اچھا شوہر مل جائے گا۔''

دان ناتھ نے دلسوزی کے ساتھ کہا ''کیا باتیں کرتے ہو۔تم سمجھتے ہو، محبت کوئی بازار کا سودا ہے۔جی چاہا لیا، جی چاہا نہ لیا۔مگر تمھارا یہ خیال غلط ہے۔ پریما محض تمھاری منگیتر نہیں ہے، تمھاری معشوقہ بھی ہے۔ یہ خبر پا کر اس کے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔ شاید اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم اپنے ساتھ ہی نہیں اس کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی کر رہے ہو۔''

امرت رائے ایک لمحہ کے لیے فکر میں ڈوب گئے۔اپنے متعلق تو انھیں ذرا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ اپنے تئیں فرض پر نثار کر سکتے تھے۔لیکن پریما کا کیا حال ہوگا، اس کا خیال انھیں نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا وہ جانتے تھے کہ پریما بلند خیال عورت ہے اور ان کے ایثار کی اس کی نگاہوں میں ضرور وقعت ہوگی۔ اگر وہ اتنی ہی فرض شناس ہے جتنا میں سمجھتا ہوں تو میرے اس فیصلے پر اسے مطلق رنج نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اسے خوشی ہوگی، کم از کم مجھے یہ امید ضرور ہے۔''

دان ناتھ نے منہ بنا کر کہا ''تم سمجھتے ہوگے کہ بڑا میدان مار آئے ہو اور جو سنے گا وہ پھولوں کا ہار لے کر تمھارے گلے میں ڈالنے دوڑے گا۔لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم محض شہرت کے بھوکے ہو۔لیکن عورتوں کو شہرت کی اتنی ہوس نہیں ہوتی۔ پریما کتنی ہی پاکیزہ خیال ہو وہ یہ کبھی پسند نہ کرے گی کہ تم اس سے اتنی بے دردی کے ساتھ کنارہ کش ہو جاؤ۔''

امرت رائے کا بنگلہ آ گیا۔موٹر رک گیا۔امرت رائے اتر کر اپنے کمرہ کی طرف چلے۔دان ناتھ ذرا اس انتظار میں کھڑے رہے کہ یہ مجھے بلائیں تو میں جاؤں، لیکن جب امرت رائے نے ان کی طرف پھر کر بھی نہ دیکھا تو انہیں خوف ہوا کہ شاید میری باتیں انھیں ناگوار گزریں۔کمرے کے دروازے پر جا کر بولے ''کیوں بھائی مجھ سے ناراض ہو گئے۔؟''

امرت رائے نے پرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا ''نہیں دان ناتھ تمھاری جھڑکیوں میں مزا ہے جو دوسروں کی واہ واہ میں نہیں۔میں جانتا ہوں تم نے اس وقت جو کہا ہے وہ محض محبت سے کہا ہے، دل میں تو تم خوب سمجھتے ہو کہ میں شہرت کا حریص نہیں بلکہ زندگی میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔''

دان ناتھ نے اندر جا کر امرت رائے کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے ''پھر سوچ لو۔ایسا نہ ہو پیچھے پچھتانا پڑے۔''

امرت رائے نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بھائی جان سچ پوچھو تو آج میں اپنے دل میں جس عالی ہمتی کا احساس کررہا ہوں، وہ ایک نیا تجربہ ہے۔ آج کئی ماہ کی کشمکش کے بعد میں نے اپنے اوپر فتح پائی ہے۔ مجھے پریما سے جتنی محبت ہے، اس سے کئی گنی محبت میرے ایک دوست کو اس سے ہے۔ اس شریف آدمی نے کبھی بھول کر بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں جانتا ہوں اس کی محبت کتنی جاں سوز، کتنی گہری اور کتنی پاکیزہ ہے۔ میں تقدیر کی کتنی چوٹیں سہہ چکا ہوں۔ ایک چوٹ اور بھی سہہ سکتا ہوں۔ لیکن میرے اس دوست نے ابھی ناکامی کی ایک چوٹ بھی نہیں سہی ہے اور یہ ناکامی اس کے لیے سوہانِ روح ہوجائے گی۔''

یہ اشارہ کس کی طرف تھا، دان ناتھ سے مخفی نہ رہا۔ جب امرت رائے کی بیوی کا انتقال ہوا اسی وقت پریما سے دان ناتھ کی شادی کا تذکرہ درپیش تھا۔ جب پریما کی بہن کا انتقال ہوگیا تو اس کے والد لالہ بدری پرشاد نے دان ناتھ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ دان ناتھ علم، دولت اور وقار، کسی بات میں بھی امرت رائے کے مدمقابل نہ تھے۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ پریما بھی امرت رائے کی جانب زیادہ متوجہ معلوم ہوتی تھی۔ دان ناتھ اتنے مایوس ہوئے کہ طے کرلیا کبھی شادی نہ کروں گا۔ دونوں دوستوں میں ذرا بھی کدورت نہ پیدا ہوئی۔ دان ناتھ یوں بظاہر تو ہمیشہ خوش رہتے تھے لیکن دنیا سے ان کا دل بیزار ہوگیا تھا۔ زندگی بار معلوم ہوتی تھی۔ امرت رائے کو اپنے دلی دوست کی حالت پر افسوس ہوتا تھا اور وہ اپنے دل کو اس آزمایش کے لیے مہینوں سے تیار کر رہے تھے لیکن پریما جیسی عدیم المثال نازنین سے دست بردار ہوجانا آسان نہ تھا۔ ایسی حالت میں دان ناتھ کا یہ اصرار دوستانہ ہمدردی پر اتنا زیادہ مبنی نہ تھا جتنا امرت رائے کے جذبۂ ایثار کی گہرائی تک پہنچنے کی خواہش پر، جس تمنا کو انھوں نے سینہ کو چیر کر نکال ڈالا تھا۔ جس کے پورے ہونے کی اس کی زندگی میں مطلق امید نہ تھی، وہی تمنا آج ان کے سینے میں مشعل کی طرح روشن ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی امرت رائے کے اس ملکوتی ایثار نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر پیدا کیا۔ رقت آمیز لہجے میں بولے ''تو کیا اسی خیال سے تم نے آج یہ فیصلہ کرلیا۔ اگر تمھارا وہ دوست اس فیصلے سے فائدہ اٹھائے تو میں کہوں گا کہ وہ تمھارا دوست نہیں دشمن ہے۔ اور پھر کیا معلوم ہے کہ اس حالت میں پریما کی شادی تمھارے دوست سے ہی ہو۔''

امرت رائے نے تشویش ناک لہجے میں کہا ''ہاں یہ اندیشہ ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا دوست اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔''

دان ناتھ نے افسردہ خاطر ہوکر کہا ''تم اسے اتنا کمینہ سمجھنا چاہو تو سمجھ لو لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ میں اس دوست کو پہچان سکا ہوں تو وہ اپنے عوض تمھیں ناکامی کا شکار نہ بننے دے گا۔''

یہ کہتے ہوئے دان ناتھ باہر نکل آئے اور امرت رائے دروازے پر کھڑے انھیں پر غرور نگاہوں سے دیکھتے رہے وہ دل میں کہہ رہے تھے، اس شخص میں کتنا ضبط ہے۔''

(2)

ادھر دونوں دوستوں میں باتیں ہو رہی تھیں ادھر لالہ بدری پرشاد کے گھر میں ماتم سا چھایا ہوا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ان کی بیوی دیوکی نے کہا ''تم ذرا امرت رائے کے پاس چلے کیوں نہیں جاتے؟''

بدری پرشاد نے اعتراض کے انداز سے کہا'' جا کر کیا کروں۔''

''جا کر سمجھاؤ اور کیا کروگے۔''

''میں اس چھوکرے کے پاس نہیں جا سکتا۔''

''آخر کیوں؟ کوئی ہرج ہے۔''

''اب تم سے کیا بتاؤں۔ جب مجھے اس کا فیصلہ معلوم ہو گیا تو میرا اس کے پاس جانا غیر مناسب ہی نہیں، اہانت آمیز ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ بدھوا بواہ (بِدھوابیاہ) کے حامی ہیں۔ سمجھتے ہیں اس سے ملک آسمان پر پہنچ جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں بدھوا بواہ ملک کے لیے زہر قاتل ہے اس سے ہندو عظمت اور پاکیزگی کے رہے سہے نشان بھی مٹ جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔''

دیوکی نے جواب دیا ''یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج اگر ہمارا کملا مسلمان ہو جائے تو کیا ہم اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں گے؟ ہم سے جہاں تک ہو سکے گا اسے سمجھائیں گے اور اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کریں گے۔''

دیوکی کے اس جواب سے بدری پرشاد کچھ نرم تو پڑے لیکن پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ بولے'' بھئی میں تو اب امرت رائے کے پاس نہ جاؤں گا۔ تم اگر سوچتی ہو کہ وہ سمجھانے سے راہ راست پر آ جائیں گے تو انھیں بلا لو، خود چلی جاؤ لیکن مجھ سے جانے کو نہ کہو، میں انھیں دیکھ کر شاید آپے سے باہر ہو جاؤں۔ کہو تو جاؤں؟''

دیوکی۔'' نہیں معاف کیجیے۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ تم نہ جاؤ۔ میں کل انھیں بلا لوں گی۔

بدری۔'' بلانے کو بلا لو، لیکن یہ میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تم ان کی خوشامد کرو'' میں پریما کو ان کے گلے لگانا نہیں چاہتا۔ اس کے لیے بر کی کمی نہیں ہے۔''

دیوکی۔'' پریما ان لڑکیوں میں نہیں ہے کہ تم اس کی شادی جس کے ساتھ چاہو کر دو، ذرا جا کر اس کی حالت تو دیکھو تو معلوم

ہو، جب سے یہ خبر ملی ہے اکیلی چھت پر پڑی رو رہی ہے۔''

بدری۔'' اجی یہ تو لڑکیوں کا قاعدہ ہے، دس پانچ روز میں آپ ہی آپ سنبھل جائے گی۔''

دیوکی۔'' کون پریما؟ میں کہتی ہوں وہ اس غم میں رو کر جان دے دے گی۔ تم ابھی اسے نہیں جانتے۔'' بدری پرشاد نے جھنجھلا کر کہا'' اگر وہ رو رو کر مر جانا چاہتی ہے تو مر جائے لیکن میں امرت رائے کی خوشامد نہ کروں گا۔''

بدری پرشاد باہر چلے گئے، دیوکی بڑے شش و پنج میں پڑ گئی۔ شوہر کی عادت سے خوب واقف تھی۔ لیکن انھیں اتنا کج فہم اس نے نہ سمجھا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ امرت رائے سمجھانے پر اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں گے لیکن ان کے پاس کیسے جائے، شوہر سے راڑ کیسے مول لے۔

دفعتاً پریما اوپر سے آ کر چارپائی کے پاس کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھیں سرخ تھیں، دیوکی نے سمجھا کر کہا'' رومت بیٹی۔ میں کل انھیں بلا لوں گی، میری بات وہ کبھی نہ ٹالیں گے۔''

پریما نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا'' نہیں اماں آپ کے پیروں پڑتی ہوں، ان سے کچھ نہ کہیے۔ میں کار خیر میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی۔ انھوں نے ہماری بدنصیب بہنوں کی خاطر یہ فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے یہاں کتنے ایسے آدمی ہیں جو اتنی جرات کر سکیں۔ میں ان کے اس نیک ارادہ میں حائل نہ ہوں گی۔''

دیوکی نے حیرت زدہ نگاہوں سے پریما کو دیکھا۔ لڑکی کیا کہہ رہی ہے، ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

پریما پھر بولی'' اگر ایسے نیک طبیعت اور روشن خیال آدمی قربانیاں نہ کریں گے تو کون کرے گا؟''

دیوکی نے پوچھا'' اور تو، اپنے دل کو کیسے سمجھائے گی بیٹی۔ اس خیال سے تجھے تسکین ہوگی؟''

پریما نے متانت سے جواب دیا'' مجھے اس کا بالکل دکھ نہیں ہے' اماں جی! میں آپ سے سچ کہتی ہوں، میں بھی اس کام میں ان کی مدد کروں گی۔ جب تک آپ لوگوں کا ہاتھ میرے سر پر ہے مجھے کس بات کی فکر ہے۔ آپ لوگ میرے لیے ذرا بھی اندیشہ نہ کریں۔ میں کنواری رہ کر بہت سکھی رہوں گی۔''

دیوکی نے پر اشک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔'' ماں باپ کس کے سدا بیٹھے رہتے ہیں بیٹی! اپنی آنکھوں کے سامنے ذرا جو کام ہو جاوے وہی اچھا۔ لڑکی تو ان کی بھی کنواری نہیں رہنے پاتی جن کے گھروں میں کھانے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ بھیک مانگ کر لوگ لڑکی کا بیاہ کرتے ہیں۔ محلّہ میں کوئی لڑکی یتیم ہو جاتی ہے تو چندہ سے اس کا بیاہ کر دیا جاتا ہے، میرے یہاں کس بات کی کمی ہے؟ میں تمھارے لیے کوئی اور لڑکا تلاش کروں گی۔ یہ جانے سنے آدمی تھے۔ اتنا ہی تھا ورنہ برادری میں ایک سے ایک پڑے ہوئے ہیں۔ میں کل تمھارے بابو جی کو بھیجتی ہوں۔''

پریما کا دل کانپ اٹھا۔ آج تین برس سے امرت رائے کی مورت کو اپنے دل کے مندر میں بٹھا کر وہ پوجتی چلی آئی تھی، اس مورت کو اس کے دل سے کون نکال سکتا تھا۔ دل میں اس مورت کو بٹھائے ہوئے کیا وہ کسی دوسرے شخص سے بیاہ کرسکتی تھی؟ وہ بیاہ ہوگا یا بیاہ کا ڈھونگ؟ اس زندگی کا خیال کتنا خوفناک، کتنا دل ہلا دینے والا تھا؟ پریما نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔

''نہیں اماں جی! میرے لیے کوئی فکر نہ کریں۔ میں نے کنواری ہی رہنے کا قصد کرلیا ہے۔''

''بابو کملا پرشاد کی آمد آمد کا شور سنائی دیا، آپ سنیما کے بے طرح دلدادہ تھے۔ روز ہی جایا کرتے تھے۔ نوکروں سے وہ سختی کے ساتھ کام لیتے تھے۔ خصوصاً باہر سے آنے پر تو کسی ایک کی مرمّت سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے بوٹ کی چرچراہٹ سنتے ہی نوکروں میں ہلچل پڑجاتی تھی۔

کملا پرشاد نے آتے ہی کہار سے پوچھا ''برف لائے؟''

کہار نے دبی زبان سے کہا ''ابھی تو نہیں سرکار۔''

کملا پرشاد نے گرج کر کہا ''زور سے بولو، برف لائے یا نہیں؟ منہ میں زبان نہیں ہے۔''

کہار کی آواز اب بالکل بند ہوگئی۔ کملا پرشاد نے کہار کے دونوں کانوں کو پکڑ کر ملاتے ہوئے کہا ''ہم پوچھتے ہیں برف لائے یا نہیں؟''

کہار نے دیکھا کہ اب بغیر منہ کھولے ہوئے کانوں کے اکھڑ جانے کا احتمال ہے تو آہستہ سے بولا۔ نہیں سرکار!

کملا - کیوں نہیں لائے ؟

کہار - پیسے نہ تھے۔

کملا - کیوں پیسے نہ تھے؟ گھر میں جا کر مانگے تھے؟

کہار - ''ہاں سرکار کسی نے سنا نہیں۔''

کملا - ''جھوٹ بولتا ہے۔ میں جا کر دریافت کرتا ہوں، اگر معلوم ہوا کہ تو نے پیسے نہیں مانگے تو کچا ہی کھا جاؤں گا راسکل۔''

کملا پرشاد نے کپڑے بھی نہیں اتارے۔ غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں جا کر ماں سے پوچھا ''کیوں اماں! بدلو تم سے برف کے لیے پیسے مانگنے آیا تھا۔''

دیوکی نے بغیر ان کی طرف دیکھے ہی کہا '' آیا ہوگا، یاد نہیں آتا، بابو امرت رائے سے ملاقات تو نہیں ہوئی ؟

کملا - ''نہیں ان سے تو ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کی طرف گیا تھا لیکن جب سنا کہ وہ کسی جلسہ میں گئے ہیں تو میں سنیما

دیکھنے چلا گیا۔ جلسوں کا تو انھیں مرض ہے اور میں بالکل فضول سمجھتا ہوں، کوئی فائدہ نہیں۔ بغیر لکچر سنے بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے اور لکچر دینے والوں کے بغیر دنیا کے پاتال میں چلے جانے کا اندیشہ نہیں۔ جہاں دیکھو لکچرار ہی لکچرار نظر آتے ہیں۔ برساتی مینڈکوں کی طرح ٹرٹر کیا اور چلتے ہوئے۔ اپنا وقت کھویا اور دوسروں کو پریشان کیا۔ سب کے سب بیوقوف ہیں۔''

دیوکی۔''امرت رائے نے تو آج ناؤ ہی ڈبودی، اب کسی بدھوا سے بیاہ کرنے کی ٹھان لی ہے'' کملا پرشاد نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا''اور یہ جلسے والے کریں گے کیا؟ یہی تو ان سبھوں کو سوجھتی ہے۔ لالہ اب کسی بیوہ سے شادی کریں گے؟ اچھی بات ہے میں ضرور بارات میں جاؤں گا۔ خواہ اور کوئی جائے یا نہ جائے۔ ذرا دیکھوں نئے ڈھنگ کی شادی کیسی ہوتی ہے۔ وہاں بھی سب لکچر بازی کریں گے۔ ان لوگوں کے لیے اور کیا ہوگا۔ سب کے سب بیوقوف ہیں۔ عقل کسی کو چھو نہیں گئی۔''

دیوکی۔''تم ذرا ان کے پاس چلے جاتے۔''

کملا۔''اس وقت تو بادشاہ بھی بلائے تو نہ جاؤں۔ ہاں کسی روز جا کر ذرا خیر و عافیت پوچھ آؤں گا۔ مگر ہے پورا خبطی! میں تو جانتا تھا کہ اس میں کچھ سمجھ ہوگی مگر نرا بونگا نکلا! اب بتاؤ زیادہ پڑھنے سے کیا فائدہ ہوا؟ بہت اچھا ہوا کہ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ بہت پڑھنے سے عقل ماری جاتی ہے۔ جب آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں تو عقل کیسے بچی رہ سکتی ہے؟ تو کوئی بیوہ بھی ٹھیک ہو گئی یا نہیں؟ کہاں ہے مصرانی؟ کہہ دو کہ اب تمھاری چاندی ہے۔ کل ہی سندیس بھیج دیں۔ کوئی اور نہ جائے تو میں جانے کو تیار ہوں۔ بڑا مزا رہے گا! کہیں ہے مصرانی۔ اب ان کی قسمت کھل رہے گی۔ برادری ہی کی بیوہ ہے نا، کہ برادری کی قید بھی نہیں رہی؟۔

دیوکی۔ یہ تو نہیں جانتی اب کیا ایسے بھرشٹ (ناپاک) ہو جائیں گے۔

کملا۔''یہ سبھا والے۔ جو کچھ نہ کر گزریں وہ تھوڑا۔ ان سبھوں کو بیٹھے بیٹھے ایسی بے پر کی اڑانے کی سوجھتی ہے۔ ایک روز پنجاب سے کوئی بوکھل (خبطی) آیا تھا کہہ گیا کہ ذات پات توڑ دو، کیوں کہ اس سے ملک میں پھوٹ بڑھتی ہے۔ بس سب کے سب بیٹھے یہی سوچا کرتے ہیں کہ کوئی نئی بات نکالنی چاہیے۔ گاندھی جی کو اور کچھ نہ سوجھی تو سوراج ہی کا ڈنکا پیٹ چلے۔ سبھوں نے عقل بیچ کھائی ہے۔'' اتنے ہی میں ایک حسینہ نے صحن میں قدم رکھا۔ کملا پرشاد کو دیکھ کر ڈیوڑھی پر ٹھٹھک گئی۔ دیوکی نے کملا سے کہا۔

''تم ذرا کمرہ میں چلے جاؤ۔ پورنا ڈیوڑھی پر کھڑی ہے۔''

پورنا کو دیکھتے ہی پریما دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ پڑوس میں ایک پنڈت بسنت کمار رہتے تھے۔ کسی دفتر میں نوکر تھے، پورنا انھیں کی بیوی تھی، بہت ہی حسین، بہت ہی نیک، مکان میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ جب دس بجے پنڈت جی دفتر چلے جاتے تو وہ یہیں چلی آتی اور دو سہیلیاں شام تک بیٹھی ہنستی بولتی رہتیں۔ پریما کو اس سے اتنی محبت تھی کی اگر کسی دن وہ کسی سبب سے نہ آتی،

وہ خود اس کے یہاں جاتی۔ آج بسنت کمار کہیں دعوت میں گئے تھے، پورنا کا جی گھبرایا تو وہ یہاں چلی آئی۔ پریما اس کا ہاتھ پکڑے اوپر کمرے میں لے گئی۔

پورنا نے چادر الگنی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے بھیا آنگن میں کھڑے تھے اور میں منہ کھولے چلی آئی تھی۔ مجھ پر ان کی نظر پڑ گئی ہوگی۔''

پریما۔ ''بھیا میں کسی کو تاکنے کی لت نہیں ہے۔ یہی تو ان میں ایک گن (وصف) ہے۔ آپ کے پنڈت جی کہیں گئے ہیں کیا؟''

پورنا۔ ''ہاں آج ایک نیوتے (دعوت) میں گئے ہیں۔''

پریما۔ ''سبھا میں نہ گئے۔ آج تو بہت بھاری سبھا ہوئی ہے؟''

پورنا۔ ''وہ کسی سبھا سماج میں نہیں جاتے۔ کہتے ہیں کہ ایشور نے دنیا بنائی ہے اور وہی اپنی مرضی سے ہر بات کا بندوبست کرتا ہے۔ میں اس کے کاموں کو سدھارنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔''

پریما۔ ''آج کی سبھا دیکھنے کے لائق تھی۔ تم ہوتیں تو میں بھی جاتی۔ سماج سدھار پر ایک مہاشے کا بڑا اچھا لکچر ہوا۔''

پورنا۔ ''عورتوں کے سدھار کا رونا رویا گیا تھا۔''

پریما۔ ''تو کیا عورتوں کے سدھار کی ضرورت نہیں ہے۔''

پورنا۔ ''پہلے مرد لوگ تو اپنی دشا (حالت) سدھار لیں۔ پھر عورتوں کی دشا سدھاریں گے۔ ان کی دشا سدھر جائے تو عورتیں آپ ہی آپ سدھر جائیں۔''

''ساری برائیوں کی جڑ مرد ہی ہیں۔''

پریما نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں بہن! سماج میں عورت مرد دونوں ہی ہیں اور جب تک دونوں کا سدھار نہ ہوگا زندگی میں سکھ نہ ملے گا۔ مردوں کے ودوان ہونے سے کیا عورتیں ودوان ہو جائیں گی۔ مرد تو زیادہ تر سادے ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ پھر عورتیں کیوں گہنوں پر جان دیتی ہیں۔ قیمتی کپڑوں کی تو کوئی بات نہیں۔ مردوں میں تو کتنے ہی بن بیاہ رہ جاتے ہیں۔ عورتوں کو کیوں بن بیاہا رہنے میں زندگی بیکار معلوم ہوتی ہے؟ بتاؤ میں تو سوچتی ہوں کہ بن بیاہا رہنے میں جو سکھ ہے وہ بیاہ کر رہنے میں نہیں۔''

پورنا نے آہستہ سے پریما کو دھکا دے کر کہا۔ ''چلو بہن تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ بابو امرت رائے سنیں گے تو تمھاری خوب خبر لیں گے۔ میں انھیں لکھ بھیجوں گی کہ یہ اپنا بیاہ نہ کریں گی، آپ کوئی دوسرا دروازہ دیکھیں۔''

پریما نے امرت رائے کے عہد کا حال نہ کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے پورنا کی نگاہ میں ان کی قدر بہت کم ہو جائے گی۔ بولی ’’وہ خود بیاہ نہ کریں گے۔‘‘

پورنا - ’’چلو جھوٹ بکتی ہو۔‘‘

پریما - ’’نہیں بہن جھوٹ نہیں۔ شادی کرنے کی ان کی خواہش نہیں ہے۔ دیدی (بڑی بہن) کے مر جانے کے بعد وہ کچھ تیاگی سے ہو گئے تھے۔ بابو جی کے بہت گھیرنے پر اور مجھ پر رحم کر کے وہ شادی کرنے پر تیار ہوئے تھے، مگر اب ان کا ارادہ بدل گیا ہے۔ اور میں بھی سمجھتی ہوں کہ جب ایک شخص خود گرہستی کے جھنجھٹ میں نہ پھنس کر سماج کی سیوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے پیر کی بیڑی بننا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں پورنا، مجھے اس کا رنج نہیں ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی کچھ کرے جاؤں گی۔‘‘

پورنا کی حیرت بڑھتی ہی گئی بولی۔ ’’آج چار بجے تک تم ایسی باتیں نہ کرتی تھیں۔ یکا یک یہ کیسی کایا پلٹ ہوگئی۔ انھوں نے کسی سے کچھ کہا ہے کیا۔‘‘

پریما- ’’بلا کہے بھی تو آدمی اپنی خواہش ظاہر کر سکتا ہے۔‘‘

پورنا- ’’میں ایک خط لکھ کر ان سے پوچھوں گی۔‘‘

پریما- ’’نہیں پورنا، تمھارے پیروں پڑتی ہوں، خط وط نہ لکھنا، میں کسی کے نیک ارادے میں رکاوٹ نہ ڈالوں گی، میں اگر اور کوئی مدد نہیں کر سکتی تو کم سے کم ان کی راہ کا کانٹا نہ بنوں گی۔‘‘

پورنا- ’’ساری عمر روتے کٹے گی کہے دیتی ہوں۔‘‘

پریما - ’’ایسا کوئی دکھ نہیں ہے جو آدمی سہہ نہ سکے۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے دکھ نہیں سکھ ہوگا۔ ورنہ وہ کبھی ایسا ارادہ نہ کرتے۔ میں ایسے حوصلے والے آدمی کا حوصلہ بڑھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ اسے گرہستی میں نہیں پھنسانا چاہتی۔ پورنا نے بے پروائی سے کہا۔ ’’تمھاری مایا (لیلا) میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہن، معاف کرنا۔ میں کبھی نہ مانوں گی کہ تم کو اس سے دکھ نہ ہوگا۔‘‘

پریما- ’’تو پھر انھیں بھی ہوگا؟‘‘

پورنا- ’’مردوں کا دل سخت ہوتا ہے۔‘‘

پریما- ’’تو میں بھی اپنا دل سخت بنالوں گی۔‘‘

پورنا- ’’اچھا بنالینا - لو اب نہ کہوں گی۔ لاؤ باجہ، تمھیں ایک گیت سناؤں پریما نے ہارمونیم سنبھالا اور پورنا گانے لگی۔‘‘

© NCERT not to be republished

(3)

ہولی کا دن آیا، محلے کے دو چار بے فکرے جمع ہو گئے۔ کوئی مرچ پیسنے لگا۔ کوئی بادام چھیلنے لگا۔ دو آدمی دودھ کا بندوبست کرنے کے لیے گئے دو آدمی سل بٹا دھونے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

دفعتاً بابو کملا پرشاد آ پہنچے۔ یہ جمگھٹا دیکھ کر بولے۔ ''کیا ہو رہا ہے بھئی! ہمارا بھی حصہ ہے نا؟''

بسنت کمار نے آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ بولے ''ضرور میٹھی پیجیے گا کہ نمکین؟''

کملا۔ اجی میٹھی پلاؤ نمکین کیا۔ مگر یار زعفران اور کیوڑا ضرور ہو۔ کسی کو بھیجیے۔ میرے یہاں سے لے آئے۔ کسی لڑکے کو بھیجیے جو اندر جا کر پریما سے مانگ لائے، کہیں بیوی صاحبہ کے پاس نہ چلا جائے ورنہ مفت گالیاں ملیں، تیوہار کے دن ان کا مزاج گرم ہو جایا کرتا ہے۔ یار بسنت کمار بیویوں کے خوش رکھنے کا آسان نسخہ بتاؤ میں تو عاجز آ گیا۔''

بسنت کمار نے مسکرا کر کہا۔ ''ہمارے یہاں تو یہ مرض کبھی نہیں ہوتا۔''

کملا۔ ''تو یار تم بڑے خوش نصیب ہو، کیا پورنا تم سے کبھی نہیں روٹھتی؟''

بسنت۔ ''کبھی نہیں۔''

کملا۔ ''کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہیں کرتی۔''

بسنت۔ ''کبھی نہیں'' یہاں تو دوامی قید ہو گئی ہے اور گھڑی بھر بھی گھر سے باہر رہوں تو جواب طلب ہوتا ہے۔ سنیما روزانہ جاتا ہوں اور ہر روز گھنٹوں مناؤ کرنا پڑتا ہے۔''

بسنت۔ ''تو سنیما دیکھنا چھوڑ دیجیے۔''

کملا۔ ''واہ واہ۔ یہ تو تم نے خوب کہی، قسم اللہ پاک کی خوب کہی، جس کل وہ بٹھائے اسی کل بیٹھ جاؤں۔ پھر جھگڑا ہی نہ ہو۔ کیوں؟ اچھی بات ہے۔ کل دن بھر گھر سے نکلوں گا نہیں۔ دیکھوں تو تب کیا کہتی ہے۔ دیکھنا اب تک وہ چھوکرا زعفران اور کیوڑا لے کر نہیں لوٹا۔ کان میں بھنک پڑ گئی ہوگی، پریما کو منع کر دیا ہوگا۔ اب تو نہیں رہا جاتا۔ آج جو کوئی میرے منہ لگا تو برا ہوگا۔ میں ابھی جا کر سب چیزیں بھیجے دیتا ہوں۔ مگر جب تک میں نہ آؤں آپ تیار نہ کرائیے گا۔ یہاں اس فن کے استاد ہیں۔ موروثی بات ہے۔ دادا ایک تولہ کا ناشتہ کرتے ہیں۔ عمر میں کبھی ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا، مگر کیا مجال کہ نشہ ہو جائے۔''

یہ کہہ کر کملا پرشاد جھلائے ہوئے گھر چلے گئے۔ بسنت کمار کسی کام سے اندر گئے تو دیکھا کہ پورنا ابٹن پیس رہی ہے۔ پنڈت جی کے بیاہ کے بعد یہ دوسری ہولی تھی۔ پہلی ہولی میں بے چارے خالی ہاتھ تھے۔ پورنا کی کچھ خاطر نہ کر سکے تھے۔ مگر اب کے انھوں نے بڑی تیاریاں کی تھیں۔ محنت کر کے کوئی ڈیڑھ سو روپیے پیدا کیے تھے۔ اس میں پورنا کے لیے ایک عمدہ ساڑھی لائے تھے۔ دو ایک چھوٹی موٹی چیزیں بھی بنوادی تھیں۔ پورنا آج وہ ساڑھی پہن کر انھیں اپسرا سی معلوم پڑنے لگی۔ پاس جا کر بولے۔ ''آج تو جی چاہتا ہے تمھیں آنکھوں میں بٹھا لوں۔''

پورنا نے ابٹن ایک پیالی میں اٹھاتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا ''یہ دیکھو میں تو پہلے ہی بیٹھی ہوئی ہوں۔''

بسنت۔ ''ذرا اشنان کرتا آؤں۔ کملا بابو اب دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔''

پورنا– ''پہلے ذرا یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔ ابٹن تو لگا دوں۔ پھر نہانے جانا۔''

بسنت– ''نہیں نہیں، رہنے دو– میں ابٹن نہ لگاؤں گا۔ لاؤ میری دھوتی دو۔''

پورنا– ''واہ ابٹن کیوں نہ لگاؤ گے۔ آج کی یہ رسم ہے۔ آ کے بیٹھ جاؤ۔''

بسنت– ''بڑی گرمی ہے۔ بالکل جی نہیں چاہتا۔''

پورنا نے لپک کر انکا ہاتھ پکڑ لیا اور ابٹن بھرا ہاتھ ان کے بدن پر پھیر دیا۔ بولی ''سیدھے سے کہتی تھی تو نہیں مانتے تھے۔ اب تو بیٹھو گے۔''

بسنت نے جھینپ کر کہا– ''مگر ذرا جلدی کرنا دھوپ ہو رہی ہے۔''

پورنا– ''اب گنگا جی کہاں جاؤ گے یہیں نہا لینا''

بسنت –''نہیں– آج گنگا کنارے بڑی بہار ہوگی۔''

پورنا– ''اچھا تو جلدی لوٹ آنا۔ یہ نہیں کہ ادھر ادھر تیرنے لگو۔ نہاتے وقت تم بہت دور تک تیر جایا کرتے ہو۔''

پنڈت جی ابٹن لگوا کر نہانے کے لیے چلے گئے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ گھاٹ سے ذرا الگ نہایا کرتے تھے۔ تیراک بھی اچھے تھے۔ کئی بار شہر کے اچھے تیراکوں سے بازی جیت چکے تھے۔ اگرچہ آج گھر سے وعدہ کر کے چلے تھے کہ تیروں گا نہیں۔ مگر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اور صاف پانی میں اٹھتی ہوئی لہریں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں کہ دل تیرنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا۔ وہ فوراً پانی میں کود پڑے اور ادھر ادھر کلیلیں کرنے لگے۔ دفعتاً انھیں منجدھار میں کوئی سرخ چیز بہتی نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو کنول تھے۔ آفتاب کی شعاعوں میں چمکتے ہوئے وہ ایسے خوشنما معلوم ہوتے تھے کہ بسنت کمار کا جی ان پر للچا گیا۔ سوچا کہ اگر یہ مل جائیں تو پورنا کے

کانوں کے لیے جھومک بناؤں۔ اس کی خوشی کا اندازہ کر کے ان کا دل ناچ اٹھا۔ بیچ دھارے تک تیر جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ انھیں پورا یقین تھا کہ میں پھول لاسکتا ہوں۔ جوانی دیوانی ہے۔ یہ نہ سوچا کہ جیوں جیوں میں آگے بڑھوں گا پھول بھی تو بڑھیں گے۔ ان کی طرف چلے اور کوئی پندرہ منٹ میں منجدھار میں پہنچ گئے۔

مگر وہاں جا کر دیکھا تو پھول اتنی ہی دور آ گئے تھے۔ اب کچھ تکان معلوم ہونے لگی تھی۔ مگر بیچ میں کوئی ریت بھی نہ پڑتی تھی جس پر بیٹھ کر دم لیتے۔ آگے ہی بڑھتے گئے کبھی ہاتھ کبھی پیروں سے زور لگاتے، پھولوں تک پہنچے۔ مگر اس وقت تک کل اعضا سست پڑ گئے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے جب پھولوں کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہا تو ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ آخر ان کو دانتوں میں دبا لیا اور پلٹ پڑے۔ مگر جب وہاں سے انھوں نے کنارے کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا گویا ہزاروں کوس کی منزل ہے۔ بدن بالکل نڈھال ہو گیا تھا اور پانی کا بہاؤ بھی خلاف تھا۔ ان کی ہمت چھوٹ گئی۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ قریب کوئی کشتی یا ڈونگی نہ تھی اور کنارے تک آواز ہی نہ پہنچ سکتی تھی۔ سمجھ گئے یہیں غرق دریا ہونا پڑے گا۔ ایک لمحہ کے لیے پورنا کی یاد آئی۔ ہائے وہ ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اسے کیا معلوم وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر چکے۔ بسنت کمار نے ایک بار پھر زور لگایا مگر ہاتھ پیر نہ ہل سکے۔ اب ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کنارے پر سے لوگوں نے انھیں دیکھا۔ دو چار آدمی پانی میں کود پڑے۔ مگر ایک ہی لمحہ میں بسنت کمار لہروں میں سما گئے۔ صرف کنول کے پھول پانی میں تیرتے رہ گئے گویا زندگی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اس کی ناکام آرزوئیں اپنا خونیں جلوہ دکھا رہی تھیں۔

(4)

لالہ بدری پرشاد کی شرافت مشہور تھی۔ ان سے ٹھگ کر کوئی پیسہ بھی نہ لے سکتا تھا۔ مذہب کے معاملہ میں وہ بہت ہی فراخ دل تھے۔ خود غرضیوں سے وہ کوسوں بھاگتے تھے، مگر محتاجوں کی مدد کرنے میں کبھی نہ چوکتے تھے۔ پھر پورنا تو ان کی پڑوسن ہی نہیں برہمنی بھی تھی، اس پر ان کی لڑکی کی سہیلی، اس کی مدد وہ کیوں نہ کرتے؟ پورنا کے ساتھ دو چار معمولی گہنوں کے سوا اور کیا تھا۔ تیرھویں کے دن اس نے وہ سب گہنے لا کر لالہ جی کے سامنے رکھ دیے اور آبدیدہ ہو کر بولی ’’میں اب انھیں رکھ کر کیا کروں گی۔‘‘

بدری پرشاد نے رقت آمیز لہجہ میں کہا ’’میں انھیں لے کر کیا کروں گا بیٹی! تم یہ نہ سمجھو کہ میں دھرم یا پُن سمجھ کر یہ کام کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ ان گہنوں کو اپنے پاس رکھو۔ کون جانے کس وقت ان کی ضرورت پڑے۔ جب تک میں زندہ ہوں تمھیں اپنی بیٹی سمجھتا رہوں گا۔ تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔‘‘

© NCERT not to be republished

تیرھویں بڑی دھوم سے ہوئی۔ کئی سو برہمنوں نے کھانا کھایا۔ دان دچھنا میں بھی کوئی کمی نہ کی گئی۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ لالہ بدری پرشاد برہمنوں کو کھانا کھلا کر لوٹے تو دیکھا کہ پریما ان کے کمرے میں کھڑی ہے۔ بولے ''یہاں کیوں کھڑی ہو بیٹی! رات بہت ہوگئی جا کر سو رہو۔''

پریما۔ آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے نا؟

بدری۔ اب اتنی رات گئے میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ تھک بھی بہت گیا ہوں لیٹتے ہی سو جاؤں گا۔

یہ کہ کر بدری پرشاد پلنگ پر بیٹھ گئے اور ایک لمحہ کے بعد بولے۔ ''کیوں بیٹی پورنا کے مائیکہ میں کوئی نہیں ہے؟ میں نے اس سے نہ پوچھا کہ شاید اس کو رنج ہو۔''

پریما۔ مائیکے میں کون ہے، ماں باپ پہلے ہی مر چکے تھے، ماما نے بیاہ کر دیا تھا۔ مگر جب سے بیاہ ہوا پھر کبھی جھانکے تک نہیں۔ سسرال میں بھی سگا کوئی نہیں ہے۔ پنڈت جی کے دم سے ناتا تھا۔

بدری پرشاد نے بستر کی چادر برابر کرتے ہوئے کہا ''میں سوچتا ہوں کہ پورنا کو اپنے ہی مکان میں رکھوں تو کیا ہرج ہے؟ اکیلی عورت کیسے رہے گی؟''

پریما۔ ہوگا بہت اچھا۔ مگر اماں جی مانیں تب تو۔

بدری۔ مانیں گی کیوں نہیں، پورنا تو انکار نہ کرے گی؟

پریما۔ ''پوچھوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ انھیں انکار نہ ہوگا۔''

بدری۔ ''اچھا مان لو کہ وہ اپنے ہی گھر میں رہے تو اس کا خرچ کوئی بیس روپیہ میں چل جائے گا۔''

پریما نے احسان مند نگاہوں سے والد کی طرف دیکھ کر کہا ''بڑے مزے سے۔ پنڈت جی پچاس ہی روپیہ تو پاتے تھے۔''

بدری پرشاد نے تشویش کے لہجہ میں کہا ''میرے لیے بیس، پچیس، تیس سب برابر ہیں۔ مگر مجھے اپنی زندگی ہی کی بات تو نہیں سوچنی ہے۔ اگر آج نہ رہوں تو کملا کل کوئی کوڑی چھوڑ کر نہ دے گا، اس کے لیے کوئی مستقل بندوبست کر دینا چاہتا ہوں۔ ابھی ہاتھ میں روپیہ نہیں ہے، ورنہ کل ہی چار ہزار روپیہ کسی معتبر بینک میں جمع کر دیتا۔ سود سے اس کی پرورش ہوتی رہتی۔ یہ شرط کر دیتا کہ اصل میں سے اس کو کچھ نہ دیا جائے۔''

دفعتاً کملا پرشاد آنکھیں ملتے ہوئے آ کر کھڑے ہوئے اور بولے۔ ''ابھی آپ سوئے نہیں۔ گرمی لگتی ہے تو پنکھا لا کر رکھ دوں۔ رات زیادہ ہوگئی۔''

بدری- ''نہیں گرمی نہیں ہے۔ پریما سے کچھ باتیں کرنے لگا تھا۔تم سے بھی کچھ صلاح لینا چاہتا تھا۔تم آپ ہی آپ آگئے۔ میں سوچتا ہوں پورنا یہیں آکر رہے تو کیا ہرج ہے۔''

کملا پرشاد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا'' یہاں اماں نہ راضی ہوں گی۔''

بدری- '' اماں کی بات چھوڑ دو۔ تمھیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

کملا پرشاد نے زور دے کر کہا'' میں تو کبھی صلاح نہ دوں گا۔ دنیا میں سبھی طرح کے آدمی ہیں۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھیں۔ ذرا دور تک سوچیے۔''

بدری- '' اس کی پرورش کے لیے تو کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی ہوگا۔''

کملا- '' ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

بدری- '' تو اور کون کرے گا۔''

کملا- '' شہر میں ہمیں تو نہیں ہیں؟ اور بہت سے مالدار لوگ ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہم بھی کچھ امداد کریں گے۔''

بدری پرشاد نے تمسخر کرتے ہوئے کہا'' تو چندہ کھول دیا جائے - کیوں؟ اچھی بات ہے تو جاؤ گھوم گھوم کر چندہ وصول کرو۔''

کملا- '' میں کیوں چندہ جمع کرنے لگا۔''

بدری- '' تب کون کرے گا؟''

کملا پرشاد نے اس معاملہ میں مطلق غور نہ کیا تھا۔ بے دلی سے بولا۔'' آخر آپ نے کوئی تجویز تو سوچی ہوگی جو مناسب سمجھیے وہ کیجیے۔''

بدری- '' میں کیا کروں گا۔ میری تجویز کی اب وقعت ہی کیا ہے۔ چراغ سحری ہوں۔ میری زندگی کا کیا ٹھکانا۔آج مرا کل دوسرا دن۔ میری آنکھیں بند ہوتے ہی تم سب درہم برہم کر ڈالو تو مفت میں اور بدنامی ہو۔''

کملا پرشاد نے بہت رنجیدہ ہو کر کہا'' آپ مجھے اتنا کمینہ خیال کرتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔''

بدری پرشاد بیٹے کو بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ میری باتوں سے اسے صدمہ پہنچا ہے، انھوں نے فوراً بات بنائی۔'' نہیں نہیں میں تمھیں کمینہ نہیں سمجھتا۔ بہت ممکن ہے کہ آج ہم جو بات کر سکتے ہیں وہ کل کے حالات تبدیل ہو جانے کے بعد نہ کر سکیں۔''

کملا - '' ایشور نہ کرے کہ میں وہ مصیبت جھیلنے کے لیے بیٹھا رہوں۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ جو کچھ کر جائیں گے،

اس میں کملا پرشاد کو بھی کسی حالت میں اعتراض نہ ہوگا۔ آپ گھر کے مالک ہیں۔ آپ ہی نے یہ دولت پیدا کی ہے۔ آپ کو اس پر پورا اختیار ہے۔ تجویز کرنے کے پیشتر میں جو چاہے کہوں۔ جب آپ ایک بات طے کر دیں گے تو میں اس کے خلاف زبان تک نہ ہلاؤں گا۔''

بدری۔ ''تو کل چار ہزار روپے پورنا کے نام بینک میں جمع کر دو اور یہ شرط لگا دو کہ وہ اصل میں سے کچھ نہ لے سکے۔ اس کے بعد روپے ہمارے ہو جائیں گے۔ کملا کو گویا چوٹ سی لگی۔ بولے ''خوب سوچ لیجیے۔''

بدری پرشاد نے تصفیہ کے لہجے میں کہا ''خوب سوچ لیا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اسے منظور کرتی ہے یا نہیں۔''

کملا۔ ''کیا اس کی منظوری میں بھی کوئی شرط ہے۔''

بدری پرشاد نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا ''تمھاری یہ بری عادت ہے کہ تم سب کو خود غرض سمجھنے لگتے ہو۔ کوئی شریف آدمی دوسروں کا احسان سر پر نہیں لینا چاہتا۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ گئے گذروں کی بات جانے دو لیکن جس میں خودداری کا ذرا بھی شائبہ ہے وہ دوسروں سے مدد نہیں لینا چاہتے۔ مجھے تو شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ پورنا کبھی اس پر رضا مند نہ ہوگی۔ وہ محنت کرے گی لیکن جب تک مجبور نہ ہو جائے ہماری مدد کو قبول نہ کرے گی۔ پریما نے بڑے جوش سے کہا ''مجھے بھی یہی شبہ ہے۔ راضی ہوگی بھی تو بڑی مشکل سے۔''

بدری۔ ''تم اس سے اس کا ذکر کرنا۔ کل ہی۔''

پریما۔ ''نہیں دادا، مجھ سے نہ بنے گا۔ وہ اور میں دونوں ہی اب تک بہنوں کی طرح رہی ہیں۔ مجھ سے اس طرح کی گفتگو اب کیسے ہوگی۔ میں تو رونے لگوں گی۔''

بدری۔ ''تو میں ہی طے کر لوں گا۔ ہاں کل شاید مجھے فرصت نہ ملے، تب تک تمھاری اماں سے باتیں ہوں گی۔ میرا خیال ہے وہ راضی ہو جائیں گی۔''

کملا پرشاد خانہ داری کے انتظام میں اپنے کو لاثانی سمجھتے تھے۔ یوں تو عقل میں وہ اپنے کو افلاطون سے رتّی بھر کم نہ سمجھتے تھے، لیکن خانہ داری میں تو ان کا کمال مسلمہ تھا۔ سینما روز دیکھتے تھے مگر کیا مجال جو جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کریں۔ منیجر سے دوستی کر رکھی تھی۔ اس کے یہاں کبھی کبھی دعوت کھا آیا کرتے تھے۔ پیسوں کا کام دھیلوں میں نکالتے تھے اور بڑی خوب صورتی سے کبھی کبھی لالہ بدری پرشاد سے اس معاملہ میں ان کی ٹھن بھی جایا کرتی تھی۔ بوڑھے لالہ جی بیٹے کی اس تنگ دلی پر کبھی کبھی کھری کھری کہہ ڈالتے تھے۔ کملا پرشاد سمجھ گئے کہ لالہ جی اس وقت کوئی اعتراض نہ سنیں گے بلکہ اعتراض سے ان پر الٹا ہی اثر پڑے گا۔

اس لیے انھوں نے مصلحت سے کام لینے کا ارادہ کیا۔علی الصباح پورنا کے دروازے پر جا کر آواز دی۔ پورنا پہلے تو ان سے پردہ کرتی تھی مگر اب بہو بن کر بیٹھنے سے کام نہ چل سکتا تھا۔ انھیں اندر بلا لیا، کملا بابو اندر جا کر چارپائی پر بیٹھے۔ ایک لمحہ میں پورنا ان کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ پورنا کی پیشانی گھونگھٹ سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن دونوں نم آنکھیں تشکر سے بھری ہوئی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔

کملا اسے دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ وہ اس ارادے سے آیا تھا کہ اسے کسی طرح سے یہاں سے ٹال دوں۔ میکے چلے جانے کی تحریک کروں۔ اسے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی کہ آیندہ اس بے کس کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی گذر بسر کیسے ہوگی۔ اس کی حفاظت کون کرے گا۔ وہ اس وقت اپنے یہاں سے ٹال کر اپنے سر کا بوجھ ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن اس بیوہ کی بھولی بھالی معصوم صورت دیکھ کر اس تنگدلی پر غیرت آئی۔ کون آدمی ایسا سنگ دل ہے جو کسی گل نازک کو توڑ کر بھاڑ میں جھونک دے۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل حسن سے متاثر ہوا۔ اندھیرے گھر میں چراغ جل اٹھا۔ تمھیں اب یہاں اکیلے رہنے میں بڑی تکلیف ہوگی، ادھر پریما بھی اکیلی گھبرایا کرتی ہے، اگر تم بھی جا کر اس کے ساتھ رہو تو کیا ہرج ہے۔''

پورنا سر نیچا کیے ایک لمحہ تک سوچنے کے بعد بولی ''ہرج کیا ہے یہاں بھی تو آپ ہی لوگوں کے بھروسے پر پڑی ہوں؟''

کملا- ''تو آج چلی چلو، بابو جی کی بھی یہی خواہش ہے، میں جا کر آدمیوں کو اسباب لے جانے کے لیے بھیجے دیتا ہوں۔''

پورنا- ''نہیں بابو جی، اتنی جلدی نہ کیجیے۔ سوچ لینے دیجیے۔''

کملا- '' اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے۔ یہاں اکیلی کیسے پڑی رہوگی؟''

پورنا- ''اکیلی تو نہیں ہوں۔ مہری بھی یہیں سونے کو کہتی ہے۔''

کملا- اچھا! وہ بلّو، ہاں بڑھیا ہے تو سیدھی مگر ترّ ی ہے۔ آخر میرے گھر چلنے میں تمھیں کیا پس وپیش ہے۔

پورنا- '' کچھ نہیں۔ پس وپیش کیا ہے۔''

کملا- ''تو آدمیوں کو جا کر بھیج دوں؟''

پورنا- بھیج دیجیے گا ابھی جلدی کیا ہے؟

کملا- ''تم ناحق اتنا سوچا کرتی ہو، پورنا! کیا تم سمجھتی ہو کہ تمھارا جانا میرے گھر کے اور لوگوں کو برا معلوم ہوگا؟''

کملا کا قیاس درست نکلا۔ پورنا کو واقعی یہی اعتراض تھا۔ مگر وہ لحاظ کے سبب اسے ظاہر نہ کر سکتی تھی۔ اس نے سمجھا بابو جی نے میرے دل کی بات تاڑ لی۔ اس سے وہ نادم ہوئی۔ بابو صاحب کے گھر والوں کے متعلق ایسا خیال اسے نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر

© NCERT not to be republished

کملا پرشاد نے اس کے پس وپیش کا خاتمہ کردیا۔ بولے۔ ’’تمھارا یہ خیال بالکل قدرتی ہے پورنا۔ مگر سوچو، میرے مکان میں ایسا کون سا آدمی ہے جو تمھاری مخالفت کرسکے۔ بابوجی کی خود ہی یہ خواہش ہے۔ مجھے تم خود ہی جانتی ہو۔ پنڈت بسنت کمار سے میری کتنی گہری دوستی تھی۔ یہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ پریما تمھاری سہیلی ہی ہے۔ بابوجی کو تم سے کتنی محبت ہے، تم یہ جانتی ہو، رہ گئی سومترا اسے ذرا برا لگے گا۔ تم سے کوئی پردا نہیں مگر اس کی پرواہ کون کرتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کا بھی تمھیں ایک گر بتائے دیتا ہوں۔ کبھی کبھی یہ منتر پڑھ دیا کرنا۔ وہ تمھاری برائی نہ کرے گی۔ بس اس کی خوبصورتی کی تعریف کردینا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تعریف کرنے سے وہ سمجھ جائے گی کہ یہ مجھے بنا رہی ہے۔ تم چاہے جتنا سرا ہو، وہ اسے ٹھیک ہی سمجھے گی۔ اسی منتر سے میں اسے نچایا کرتا ہوں۔ وہی منتر تمھیں بتائے دیتا ہوں۔‘‘

پورنا کو ہنسی آگئی بولی ’’آپ تو ان کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ بھلا ایسا کون ہوگا جسے اتنی سمجھ نہ ہو۔‘‘

کملا- اتنی سمجھ کو تم معمولی بات سمجھ رہی ہو۔ تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا۔ مگر اپنی تعریف سن کر ہم اتنے متوالے ہوجاتے ہیں کہ پھر ہم میں اچھا برا سمجھنے کی تمیز ہی نہیں رہ جاتی۔ بڑے سے بڑا مہاتما بھی اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھول اٹھتا ہے۔ ہاں تعریف کرنے والے کے لفظوں میں بھگتی (عقیدت) کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعرا کو جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنے کے لیے راجے مہاراجے انعام واکرام کیوں دیتے۔ بتاؤ راجا صاحب طمنچہ کی آواز سن کر چونک پڑتے ہیں۔ کانوں میں انگلی ڈال لیتے ہیں اور گھر میں بھاگتے ہیں۔ مگر دربار کا شاعر شجاعت میں ارجن اور درونا چاریہ سے دو ہاتھ اور اونچا اٹھا دیتا ہے تو راجا صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ انھیں مطلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ میرا مضحکہ اڑایا جارہا ہے۔ ایسی تعریفوں میں ہم الفاظ کو نہیں، ان کے چھپے ہوئے جذبات کو دیکھتے ہیں۔ سمترا رنگ روپ میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتی۔ اسے نہ جانے یہ خبط کیسے ہوگیا۔ یہ کہتے ہوئے بہت رنج ہوتا ہے۔ مگر ایسی عورت کے ہاتھوں میری زندگی خراب ہوگئی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب آدمی ہوں۔ شاید پچھلے جنم کے گناہوں کا پرائشچت کررہا ہوں۔ سمترا سے بولنے کو جی نہیں کرتا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا کہ گھر میں کہرام نہ مچ جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں میں آوارہ ہوں۔ تفریح کے لیے سنیما اور تھیٹر جاتا ہوں لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں پورنا میں ان تماشوں میں محض اپنے دردِ دل کو بہلانے کے لیے جاتا ہوں۔ اپنی گرسنہ آرزوؤں کو اور کیسے سمجھاؤں۔ دل کی آگ کو کیسے بجھاؤں۔ کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ سنیاسی ہوجاؤں اور شاید، ایک دن مجھے ...... یہی کرنا پڑے گا۔ تم سمجھتی ہوگی یہ حضرت کہاں کا پچھڑا لے بیٹھے۔ معاف کرنا۔ نہ جانے میں آج کیوں تم سے یہ تذکرہ کرنے لگا۔ آج تک میں نے ان خیالات کو کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ حسرت نصیب دل ہی سے ہمدردی کی امید ہوتی ہے۔ بس یہ سمجھ لو، تو میں جاکر آدمیوں کو بھیجے دیتا ہوں۔ تمھارا اسباب

© NCERT not to be republished

اٹھالے جائیں۔ پورنا کو اب کیا عذر ہوسکتا تھا۔ اس کا جی اب بھی گھر چھوڑنے کو نہ چاہتا تھا لیکن اب وہ اس تحریک کو نہ ٹال سکی۔ اسے یہ خوف بھی ہوا کہ میرے انکار سے ان کو ملال نہ ہو۔ اس بے کس کے لیے اس وقت تنکے کا سہارا بھی بہت تھا، تو بھلا اس کشتی کو کیسے حقیر سمجھتی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے پار لے جانے والی کشتی نہیں بلکہ ایک خوفناک دریائی جانور ہے جو اس کی روح کو نگل جائے گا۔

(5)

پورنا کو اپنے گھر سے نکلتے وقت بہت رنج ہونے لگا۔ اس نے اپنی بامسرت زندگی کے تین سال اسی گھر میں کاٹے تھے۔ یہیں سہاگ کے سکھ دیکھے۔ یہیں رنڈاپے کے دکھ بھی دیکھے۔ اس گھر کو چھوڑتے اس کا دل پھٹتا جاتا تھا۔ جس وقت چاروں کہار اس کا اسباب اٹھانے کے لیے گھر میں آئے تو یکا یک رو پڑی۔ اس کے دل میں کچھ ایسے جذبات پیدا ہوگئے جیسے نعش کے اٹھاتے وقت سوگ کرنے والوں کے دل میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نعش گھر میں نہیں رہ سکتی اور جتنی جلدی اس کا کفن دفن ہوجائے اتنا ہی اچھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے اس کی محبت کے جوش میں آکر اس کے پانو سے لپٹ جاتے ہیں اور پابوسی سے پاگل ہوکر ہلا دینے والی آواز میں رو پڑتے ہیں۔ یہ گمان باطل کہ شاید لاش میں زندگی کے کچھ آثار باقی ہوں، ایک پردہ کی طرح آنکھوں کے سامنے سے دور ہوجاتا ہے اور دنیاوی محبت کا آخری رشتہ شکست ہوجاتا ہے۔ اسی طرح پورنا بھی مکان کے ایک گوشہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اپنے پیارے سوامی کی یادگار کا یہ سہارا بھی رنج کے بحرِ بےکراں میں غائب ہوگیا۔ اس مکان کا ایک ایک گوشہ اس کے لیے دل کش یادگاروں سے مملو تھا، سہاگ کے سورج کے غروب ہوجانے پر بھی یہاں اس کی کچھ چمک نظر آتی تھی۔ سہاگ کے سہانے گیت کے ختم ہوجانے پر بھی یہاں اس کی گونج اٹھ رہی تھی۔ اس مکان میں ادھر ادھر چلتے ہوئے اسے اپنے سہاگ کا دکھ بھرا گھمنڈ محسوس ہوتا رہتا تھا۔ آج اس سورج کی آخری چمک مٹی جارہی تھی۔ آج اس گیت کی وہ گونج ایک غیر محدود خلا میں ڈوبی جاتی تھی۔ آج گھمنڈ دل کو چیر کر نکلا جارہا تھا۔

پڑوس کی عورتوں کو جب معلوم ہوا کہ پورنا یہاں سے جارہی ہے تو سب اسے رخصت کرنے آئیں۔ پورنا کے اخلاق وانکسار نے سبھی کے قلوب کو مسخر کرلیا تھا۔ پورنا کے پاس دولت نہ تھی مگر میٹھی باتیں تھیں۔ بشاش چہرہ تھا۔ ہمدردی تھی۔ خدمت گزاری تھی جو دولت کی بہ نسبت کہیں زیادہ قیمتی جواہر ہیں اور جن کی ضرورت لوگوں کو دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پورنا ان سبھوں سے گلے مل کر رخصت ہوئی، گویا لڑکی سسرال جاتی ہو۔ شام کے وقت وہ اپنی مہری بلو کے ساتھ روتی ہوئی اس طرح چلی گویا کوئی جلاوطن ہو۔ پیچھے مڑ مڑ کر اپنے پیارے گھر کو دیکھتی جاتی تھی۔ گویا اس کا دل وہیں رہ گیا ہو۔

پریما اپنے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پورنا کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اس گھر میں پورنا عموماً روز ہی آیا کرتی تھی۔ یہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہوجاتا تھا۔ ہنسی کھیل میں وقت کٹ جاتا تھا مگر آج اس گھر میں قدم رکھنے میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ شاید وہ پچھتا رہی تھی کہ ناحق ہی آئی۔ پریما کے گلے مل کر بھی اس کا دل خوش نہ ہوا تب وہ سہیلی کی حیثیت سے آتی تھی۔ آج وہ ان کی دست نگر بن کر آئی تھی۔ تب اس کا آنا معمولی بات تھی۔ اس کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ ہوتی تھی۔ لوگ اس کی پیشوائی کے لیے نہ دوڑتے تھے۔ آج اس کے آتے ہی دیوکی مودی خانہ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر نکل آئی۔ سمترا اپنے بال گتھا رہی تھی۔ آدھی گتھی ہوئی چوٹی پر آنچل ڈال کر بھاگی۔ مہریاں اپنے اپنے کام چھوڑ کر نکل آئیں۔ کملا پرشاد پہلے ہی آنگن میں کھڑے تھے۔ لالہ بدری پرشاد سندھیا کرنے جا رہے تھے۔ اسے ملتوی کر کے آنگن میں آپہنچے۔ یہ خاطر داریاں دیکھ کر پورنا کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس دل جوئی کا باعث اعزاز نہیں رحم تھا۔

دیوکی کو سمترا کی کوئی بات نہ بھائی تھی۔ اس کا ہنسنا، بولنا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، پہننا، اوڑھنا، سبھی انھیں پھوہڑ پن کی انتہائی حد سے تجاوز کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ اس کی سخت تنقید کرتی رہتی تھیں۔ ان کی تنقیدوں میں محبت اور بزرگانہ نصیحت کا رنگ تھا یا منافرت کا، اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ سمترا تو اسے منافرت ہی سمجھتی تھی اس لیے وہ انھیں اور بھی چڑھاتی رہتی تھی۔ دیوکی سویرے اٹھنے کی تاکید کرتی تھی۔ سمترا پہروں دن چڑھے اٹھتی۔ دیوکی گھونگھٹ نکالنے کو کہتی تھی۔ سمترا اس کے جواب میں آدھا سر کھلا رکھتی تھی۔ دیوکی مہریوں سے احتراز کرنے کی تعلیم دیتی تھی، سمترا مہریوں سے ہنسی دل لگی کرتی رہتی تھی۔ دیوکی کو پورنا کا یہاں آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سمترا اسے بھانپ گئی۔ پہلے ہی سے اس نے شوہر کی اس تجویز پر ناک سکیڑی تھی۔ یہ جان کر کہ یہ تجویز پوری ہو کر رہے گی، اس نے اس سے اختلاف کر کے اپجس (اپ یش) لینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ ساس کے دل کا رنگ سمجھ رہی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ پورنا بھی سمجھ رہی ہے۔ اس لیے پورنا سے اسے محبت اور ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اب تک دیوکی پورنا کو دکھا کر سمترا کو شرمندہ کرنا چاہتی تھی اس لیے سمترا پورنا سے جلتی تھی۔ آج دیوکی پورنا سے بے اعتنائی کر رہی تھی اس لیے سمترا کا اس سے بہناپا ہوجانا لازم ہوگیا۔

پورنا آج بھی بہت دیر تک پریما کے پاس نہ بیٹھی۔ دل بہت اداس تھا۔ آج اسے اپنی حالت کا اندازہ ہوا تھا۔ اتنی جلدی اس کی حالت کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ یہ آج اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ گھر اس کے کھپریل والے گھر سے کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کے کمرے میں فرش تھا، چارپائی تھی، الماریاں تھیں، برقی روشنی تھی، پنکھا تھا، مگر اس وقت بجلی کی روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور پنکھے کی ہوا شعلہ کی طرح جسم کو جھلسائے ڈالتی تھی۔ پریما کے بہت اصرار کرنے پر بھی وہ آج کچھ نہ کھا سکی۔ تقدیر اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اس کے سر تاج کو اس کے ہاتھ سے چھین کر اب اس کو کھلونے سے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دونوں

© NCERT not to be republished

آنکھیں پھوڑ کر اسے سہانے منظر کی سیر کرا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر جل بہار کرنے کے لیے اتھاہ سمندر میں ڈھکیل رہی تھی۔

گیارہ بج گئے تھے۔ پورنا روشنی سے آنکھیں ہٹا کر تاریکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس گہری تاریکی میں اسے کتنے خوش نما منظر نظر آ رہے تھے۔ وہی اپنا کھپریل کا مکان تھا۔ وہی پرانی چارپائی تھی۔ وہی چھوٹا سا صحن تھا اور اس کے شوہر دفتر سے آ کر اس کی طرف ہنستے ہوئے اور محبت بھری نگاہوں سے تاکتے ہوئے جیب سے کوئی چیز نکال کر دکھاتے اور چھپا لیتے تھے۔ وہ بیٹھی ہوئی پان لگا رہی تھی۔ جھپٹ کر اٹھی اور شوہر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی ''دکھا دو کیا ہے؟'' شوہر نے مٹھی بند کر لی، اس کی دلچسپی اور بڑھی۔ اس نے خوب زور لگا کر مٹھی کھولی۔ مگر اس میں کچھ نہ تھا، آہ، آج اس کھیل، اس چھیڑ چھاڑ میں اسے اپنی زندگی کی تفسیر چھپی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

دفعتاً سمترا نے آ کر پوچھا ''ارے تم وہاں کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو۔ میں نے سمجھا تھا تمھیں نیند آ گئی ہوگی۔''

پورنا نے آنسو پونچھ ڈالے اور سنبھل کر کہا ''یہ تو تم جھوٹ کہتی ہو بہن۔ یہ سوچتیں تو تم آتیں کیوں؟''

سمترا نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا ''سوچا تو یہی تھا سچ کہتی ہوں، مگر نہ جانے کیوں چلی آئی۔ شاید تمھیں سوتا دیکھ کر لوٹ جانے ہی کے لیے آئی تھی، سچ کہتی ہوں۔ اب لیٹو نا رات تو بہت ہوگئی۔''

پورنا نے کچھ متفکر ہو کر پوچھا ''اب تک تم کیسے جاگ رہی ہو؟''

سمترا- تمام دن سویا جو کرتی ہوں۔

پورنا- تو کیوں سوتی ہو تمام دن؟

سمترا- یہی رات کو جاگنے کے لیے۔

سمترا ہنسنے لگی، ایک لمحہ میں یکا یک اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ بولی ''اپنے ماں باپ کی زر پرستی کا پرائشچت کر رہی ہوں بہن اور کیا'' یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہوگئی۔

پورنا یہ سن کر متحیر ہوگئی۔ اس کی زندگی کے نغمۂ شیریں میں یہ کرخت آواز کیوں؟

سمترا کسی اندرونی تکلیف سے بے قرار ہو کر بولی ''تم دیکھ لینا بہن! ایک روز یہ محل ڈھہ جائے گا۔ یہ بددعا میرے منہ سے بار بار نکلتی ہے۔''

پورنا نے تعجب سے کہا ''ایسا کیوں کہتی ہو بہن'' پھر اسے ایک بات یاد آ گئی، پوچھا ''کیا ابھی بھیا جی نہیں آئے۔''

سمترا دروازے کی طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''ابھی نہیں، بارہ ہی تو بجے ہیں، اتنی جلدی کیوں آئیں گے؟ نہ ایک، نہ دو، نہ تین۔ میرا بیاہ تو اس محل سے ہوا ہے۔ لالہ بدری پرشاد کی بہو ہوں۔ اس سے زیادہ سُکھ کا خیال کون کرسکتا ہے؟ بھگوان نے کس لیے مجھے جنم دیا، سمجھ میں نہیں آتا۔ اس گھر میں میرا کوئی اپنا نہیں ہے بہن! میں زبردستی پڑی ہوئی ہوں۔ میرے مرنے جینے کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔ تم سے یہی التجا ہے کہ مجھ پر رحم کرنا۔ ٹوٹے ہوئے تاروں سے میٹھے سر نہیں نکلتے تھے۔ تم سے نہ جانے کیا کیا کہوں گی۔ کسی سے کہہ نہ دینا، نہیں تو اور مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔ ہم دونوں دکھیا ہیں۔ تمھارے دل میں میٹھی یادیں ہیں، میرے دل میں وہ بھی نہیں۔ میں نے سکھ دیکھا ہی نہیں، اور نہ دیکھنے کی امید ہی رکھتی ہوں۔''

پورنا نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا ''میری تقدیر سے اپنی تقدیر کا مقابلہ نہ کرو بہن، دست نگری سے بڑی مصیبت بدنصیبی کے خزانے میں بھی نہیں ہے۔''

سمترا سوکھی ہنسی ہنس کر بولی۔ ''وہ مصیبت کیا میرے سر نہیں ہے بہن! اگر مجھے کہیں ٹھکانا ہوتا، اس گھر میں لمحہ بھر بھی نہ رہتی۔ سینکڑوں بار والدین کو لکھ چکی ہوں کہ مجھے بلالو میں عمر بھر تمھاری خدمت کرتی رہوں گی۔ مگر انھوں نے بھی میری طرف سے اپنا دل سخت کرلیا ہے۔ جواب میں نصیحتوں کا ایک دفتر آجاتا ہے، جسے میں کبھی نہیں پڑھتی۔ اس گھر میں صرف میرے سسر ہیں جنھیں ایشور نے دل دیا ہے۔ اور سب کے سب پتھر کے دیوتا ہیں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں بہن! مجھے اس کا رنج نہیں ہے کہ یہ حضرت کیوں اتنی رات گئے گھر کو آتے ہیں یا ان کا دل کسی اور سے اٹکا ہوا ہے۔ اگر آج مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ کسی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں تو میری آدھی تکلیف مٹ جائے۔ میں موسلوں سے ڈھول بجاؤں۔ مجھے تو یہ رونا ہے کہ ان کے دل ہی نہیں بلکہ دل کی جگہ خودغرضی کا ایک روڑا رکھا ہوا ہے۔ نہ کتابوں سے دلچسپی، نہ گانے سے نہ کھیل سے۔ دلچسپی ہے صرف پیسے سے! مجھے تو یقین نہیں کہ انھیں سنیما میں مزہ آتا ہوگا، وہاں بھی کوئی نہ کوئی غرض ہے لین دین، سوائے ڈیوڑھے، گھاٹے، نفع میں ان کی جان بسی رہتی ہے اور مجھے ان باتوں سے نفرت ہے۔ کمرے میں آتے ہیں تو پہلی بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ بتی ابھی تک کیوں نہیں بجھائی۔ وہ دیکھو سواری آگئی۔ اب گھنٹے دو گھنٹے کفایت کی نصیحت سننی پڑے گی۔ یوں میں روپے کو ہیچ نہیں سمجھتی۔ جمع کرنا اچھی بات ہے مگر یہ کیا، کہ آدمی روپے کا غلام ہوجائے۔ صرف انھیں چڑھانے کے لیے کچھ نہ کچھ فضول خرچی کیا کرتی ہوں۔ مزا تو یہ ہے کہ انھیں اپنے ہی پیسوں کی ماکھ نہیں ہوتی، میں اپنے پاس سے کچھ خرچ نہیں کرسکتی! پتا جی (والد صاحب) مہینے میں چالیس پچاس روپے بھیج دیتے ہیں۔ ورنہ اس گھر کی کانی کوڑی نہ ملے۔ میری جو خواہش ہوتی ہے، کرتی ہوں۔ سو وہ بھی آپ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس پر بھی کئی بار جھگڑا ہوچکا ہے۔ سونے لگنا تو بتی بجھا دینا۔ بہن جاتی ہوں۔''

سمترا چلی گئی۔ پورنا نے بتی بجھادی اورلیٹی۔ مگر نیند کہاں؟ آج ہی اس مکان میں قدم رکھا تھا اورآج ہی اس کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہورہا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ وہ بہت دن یہاں نہ رہے گی۔

(6)

لالہ بدری پرشاد کے لیے امرت رائے سے اب کوئی واسطہ رکھنا غیرممکن تھا۔ شادی تو دوسری بات تھی، سماج میں اتنی زبردست بداخلاقی کا موید بن کرامرت رائے نے خود کو ان کی نظروں سے گرادیا تھا۔ ان سے اب کسی قسم کا تعلق پیدا کرنا بدری پرشاد کے لیے ذلت کی بات تھی۔ امرت رائے کے بعد دان ناتھ سے بہتر شخص انھیں کوئی اورنظر نہ پڑا۔ زیادہ پرسش وجستجو کرنے کا اب موقع بھی نہ تھا۔ امرت رائے کے انتظار میں پہلے ہی بہت دیر ہوچکی تھی۔ برادری میں لوگ انگشت نمائی کرنے لگے تھے۔ نئے شخص کی جستجو میں شادی کے ایک غیرمعین وقت تک ٹل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے دل کو ادھرادھر نہ دوڑا کر انھوں نے دان ناتھ ہی کے ساتھ عقد پختہ کرنے کا تہیہ کرلیا، دیوکی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ پریما نے اس معاملہ میں لاپرواہی ظاہر کی۔ اب اس کے لیے سبھی مرد برابر تھے اور ہرکسی کے ساتھ زندگی کا نباہ کرسکتی تھی۔ اس کی چلتی تو وہ دوشیزہ ہی رہنا پسند کرتی۔ مگر جوان لڑکی بیٹھی رہے یہ خاندان کے لیے بدنامی کی بات تھی۔ اس معاملے میں وہ کسی قسم کی بے جا ضد کرکے والدین کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔

جس دن امرت رائے نے وہ زبردست عہد کیا۔ اسی دن پریما نے سمجھ لیا کہ اب زندگی میں میرے لیے سکھ کا خاتمہ ہوگیا مگر بن بیاہ رہ کر اپنا مضحکہ کرانے کی بہ نسبت کسی کی ہوکر رہنا کہیں زیادہ بہتر تھا۔ آج سے دوتین برس قبل دان ناتھ ہی سے اس کے بیاہ کی بات چیت ہورہی تھی۔ اسے وہ جانتی ہی تھی۔ درمیان میں حالات تبدیل نہ ہوگئے ہوتے تو آج وہ دان ناتھ کے گھر میں ہوتی۔ دان ناتھ کو وہ کئی بار دیکھ بھی چکی تھی۔ اس میں محبت ہے، شرافت ہے، علمیت ہے، یہ باتیں اسے معلوم تھیں، ان کی نیک چلنی پر بھی کسی کو شبہہ نہ تھا۔ وہ دیکھنے میں بھی بہت سجے گٹھے آدمی تھے۔ برہمچریہ (تجرّد) کی رونق چہرے پر نمایاں تھی۔ انھیں اس سے محبت تھی۔ یہ راز پریما سے مخفی نہ تھا۔ آنکھیں دل کے راز کو آشکار کرہی دیتی ہیں۔ امرت رائے نے مذاق ہی مذاق میں پریما سے اس کا تذکرہ بھی کردیا تھا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی پریما کو ان کا اگر کچھ خیال تھا تو وہ اتنا ہی کہ وہ امرت رائے کے دلی دوست ہیں۔ ان میں بڑی محبت ہے۔ وہ دولت مند نہیں تھے مگر یہ کوئی عیب نہ تھا، کیوں کہ پریما شوقین نہ تھی۔ کیوں اس کا دل امرت رائے کی طرف رجوع ہوتا تھا۔ اس کا کوئی خاص سبب اس کو نہ معلوم تھا۔ مگر ایسی حالت میں اس کے لیے کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ اب تک اس نے دان ناتھ کو کبھی اس نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔ مگر اب دل میں وہ جگہ خالی ہوجانے کے بعد دان ناتھ کو اس میں بٹھانے میں اسے

تکلیف نہ ہوئی۔ اس نے دل کو ٹٹول کر دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دان ناتھ سے محبت بھی کر سکتی ہے۔ بدری پرشاد شادی کے معاملے میں اس کی رضامندی ضروری سمجھتے تھے۔ پریما تیار تھی۔ اس لیے دان ناتھ کے پاس پیغام بھیج دیا۔

دان ناتھ اب بڑے شش وپنج میں پڑے۔ یہ پیغام پاتے ہی انھیں خوشی سے پھول اٹھنا چاہیے تھا۔ مگر یہ بات نہ ہوئی۔ انھیں اپنی منظوری لکھ بھیجنے میں ایک ہفتہ سے زائد لگ گیا۔ طرح طرح کے اندیشے ہوتے تھے۔ وہ پریما کو خوش رکھ سکیں گے؟ اس کے دل پر قابو پاسکیں گے؟ ایسا نہ ہو کہ زندگی وبال ہوجائے؟ ان کا دل ان سوالات کا بہت ہی تشفی بخش جواب دیتا تھا۔ محبت میں اگر دل کو کھینچنے کی طاقت ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے لیکن اخلاقی اعتبار سے انھیں اپنا طرزِ عمل دوستی ہی کے خلاف نہیں، شرافت کے خلاف بھی معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جان سے زیادہ پیارے دوست کی بے نفسی سے فائدہ اٹھانے کا خیال انھیں پریشان کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا گھر جل رہا ہے اور وہ تاپ رہے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ پریما سے جتنی محبت مجھے ہے، اتنی امرت رائے کو نہیں ہے۔ اس کے بغیر انھیں اپنی زندگی خشک معلوم ہوتی تھی۔ ان کا میلان متاہل زندگی کی جانب تھا۔ خدمت کے جذبات ان کی فطرت میں نہ تھے۔ نام ونمود کی تمنا بھی نہ تھی۔ ایثار کا ذکر تو بہت دور کی بات تھی۔

بالآخر بہت غور وخوض کے بعد انھوں نے طے کیا ’’ایک بار امرت رائے کو پھر ٹٹولنا چاہیے۔ اگر اب بھی وہ ان کی رائے تبدیل کر سکے تو عین خوشی کی بات ہوگی۔ زندگی کی مسرت تو تمنا میں ہے۔ بالفرض یہ خواہش پوری ہوئی تو کوئی دوسری آ کھڑی ہوگی۔ جب ایک نہ ایک خواہش کا موجود رہنا یقینی ہے تو یہی کیوں نہ رہے، اس سے اور مسرت انگیز دوسری کونسی خواہش ہوسکتی ہے؟ اس کے سوا یہ اندیشہ بھی تو تھا کہ کہیں زندگی کا یہ ناٹک فراقیہ نہ ثابت ہو۔ پہلی محبت کتنی لافانی ہوتی ہے اسے وہ خوب جانتے تھے۔

آج کل کالج تو بند تھا مگر دان ناتھ ’’ڈاکٹر‘‘ کے لقب کے لیے ایک نئی کتاب لکھ رہے تھے۔ کھانا کھا کر کالج چلے جاتے تھے۔ یہاں کتب خانے میں بیٹھ کر جتنی آسانیاں تھیں وہ مکان پر نہ ہوسکتی تھیں۔ آج وہ تمام دن کتب خانے میں بیٹھے رہے مگر نہ تو ایک حرف لکھا اور نہ ایک سطر پڑھی۔ انھوں نے مشکل کام کر ڈالنے کا آج تہیہ کرلیا تھا جسے وہ کئی روز سے ٹالتے آرہے تھے۔ کیا کیا باتیں ہوں گی، دل میں یہی سوچتے ہوئے وہ امرت رائے کے بنگلے پر جا پہنچے۔ آفتاب پھولوں اور پتیوں پر اپنی آخری برکت کی زریں بارش کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ ٹم ٹم تیار کھڑی تھی مگر امرت رائے کا پتا نہ تھا۔ نوکر سے پوچھا تو معلوم ہوا کمرے میں ہیں۔ کمرے کے دروازے کا پردہ اٹھاتے ہی بولے ’’بھلے آدمی، تمھیں گرمی بھی نہیں لگتی، یہاں سانس لینی مشکل ہے اور بیٹھے ہوئے تپسیا کررہے ہیں۔‘‘

روشنی کی ایک باریک شعاع چق کے اندر جاتی ہوئی امرت رائے کے چہرے پر پڑی۔ دان ناتھ چونک پڑے، وہ چہرہ زرد

ہو رہا تھا، آٹھ دس روز قبل جو رونق تھی اس کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ گھبرا کر کہا ''یہ تمھاری کیا حالت ہے؟ کہیں لو تو نہیں لگ گئی؟ کیسی طبیعت ہے؟''

امرت رائے نے دان ناتھ کو گلے لگاتے ہوئے کہا'' ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ تم نے مجھے دیکھ کر یہ کہا ہو، آج کل تم خوب تندرست ہو۔ تمھیں تو میں ہمیشہ ہی بیمار نظر آتا ہوں۔ ہر مرتبہ پیشتر سے زیادہ۔ جیتا کیسے ہوں، یہ ایشور ہی جانے مگر ذرا اپنی صورت تو دیکھو۔ دنیا بھر کے اصولوں کو چاٹے بیٹھے ہو مگر اتنا نہیں ہوسکتا کہ شام کو سیر ہی کر لیا کرو۔''

دان ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' میرے پاس ٹم ٹم ہوتی تو سارا دن دوڑتا۔ گھوڑا بھی یاد کرتا کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ پیادہ پا تو مجھے گھومنے میں لطف نہیں آتا۔ تمھیں دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ جسم کی حفاظت کرو۔ تمھی نے دنیا کی نجات کا ٹھیکہ لیا ہے۔ یہاں کیا ایک روز چپکے سے دنیا سے چل دینا ہے۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ باقاعدہ زندگی بسر کروں مگر جب نبھ جاوے تب تو۔ کتنی بار ڈنڈ، مگدر، ڈینل شروع کیا، مگر کیا کبھی نباہ سکا؟ آخر سمجھ گیا تندرستی میرے لیے ہے ہی نہیں، پھر اس کے لیے کیوں مفت حیران ہوں؟ اتنا جانتا ہوں کہ دائم المریض لوگوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں۔ تم ایک بار ملیریا کے موسم میں مر کے جیتے ہو۔ تمھیں بخار آتا ہے۔ سیدھا 106 درجہ تک جا پہنچتا ہے۔ مجھے ایک تو بخار آتا ہی نہیں، اور آیا بھی تو 101 درجے سے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں کرتا۔ دیکھ لینا تم مجھ سے پہلے رخصت ہوگے۔ حالاں کہ میری دلی تمنا یہی ہے کہ تمھاری گود میں میری جان نکلے۔ اگر تمھارے سامنے مروں تو میری یادگار ضرور قائم کرنا۔ تمھاری یادگار قائم کرنے والے تو بہت نکل آئیں گے مگر میری دوڑ تو تمھیں تک ہے! میری عظمت سے اور کون واقف ہے۔''

ان شرارت آمیز الفاظ میں مذاق کے ساتھ کتنا لگاؤ، کتنی زبردست محبت بھری ہوئی تھی کہ دونوں ہی دوستوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دان ناتھ مسکرا پڑے۔ مگر امرت رائے کا چہرہ متین ہوگیا۔ دان ناتھ ہنس مکھ تھے مگر مذاق کا طرز سوزِ باطن کا پتا دے رہا تھا۔ امرت رائے نے پوچھا۔'' لال بدری پرشاد کے یہاں سے کوئی پیغام آیا؟ تم ادھر کئی روز سے دکھائی نہیں دیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں اپنا رنگ جما رہے ہوگے اس لیے گیا بھی نہیں۔''

امرت رائے نے اس معاملے کو چھیڑ کر دان ناتھ پر بڑا احسان کیا۔ ورنہ وہ یہاں گھنٹوں غپ شپ کرتے رہنے پر بھی وہ بات زبان پر نہ لا سکے۔ اب بھی ان کے بشرے سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ تذکرہ فضول چھڑ گیا۔ بڑے تامّل کے ساتھ بولے۔'' ہاں پیغام تو آیا ہے، مگر میں نے جواب دے دیا۔''

امرت رائے نے گھبرا کر پوچھا'' کیا جواب دے دیا؟''

دان ناتھ – ’’جو میرے جی میں آیا۔‘‘

امرت – ’’آخر سنوں تو تمھارے جی میں کیا آیا؟‘‘

دان ناتھ – ’’یہی کہ مجھے منظور نہیں۔‘‘

امرت – ’’یہ کیوں بھئی، کیا پریما تمھارے قابل نہیں؟‘‘

دان ناتھ–’’نہیں یہ بات نہیں۔ میں خود اس کے قابل نہیں ہوں۔‘‘

امرت رائے نے تیز لہجہ میں کہا۔’’اس کے قابل نہیں ہو تو اتنے دنوں سے اس کے لیے تپسیا کیوں کر رہے ہو؟ میں درمیان میں نہ آپڑتا تو اس میں بھی کیا کوئی شبہہ ہے کہ اس سے تمھارا عقد ہو گیا ہوتا؟ میں نے دیکھا کہ تم اس غم میں اپنی زندگی برباد کیے ڈالتے ہو۔تم نے کتنے ہی پیغام لوٹا دیے، حتیٰ کہ مجھے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں تمھارے راستے سے ہٹ جاؤں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اس کی جدائی میں گھلتے گھلتے کہیں تم ایک دن مجھے تنہا چھوڑ کر چلتا دھندا نہ کرو۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ میں اس صدمے کو برداشت کر سکتا ہوں، مگر تم نہیں برداشت کر سکتے۔ بھلے آدمی! تمھارے لیے تو میں نے اپنے دل پر اتنا بڑا جبر کیا اور اب تم کاوے کاٹ رہے ہو۔ اب اگر تم نے ذرا بھی چون و چرا کی تو میں مار ہی ڈالوں گا۔ سمجھ لینا۔ چپکے سے میری ٹمٹم پر بیٹھو اور لالہ بدری پرشاد کے پاس جا کر معاملہ طے کر آؤ۔‘‘

دان ناتھ نے برقی بٹن دباتے ہوئے کہا۔’’تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتے ہو اتنا آسان نہیں ہے، کم ازکم میرے لیے۔‘‘

امرت رائے نے دوست کے چہرے کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔’’میں یہ جانتا ہوں، بیشک آسان نہیں ہے۔ میں ہی رکاوٹ ڈالنے والا تھا۔ میں اب بھی ہوں لیکن تم جانتے ہو کہ میں نے ایک بار جو بات ٹھان لی۔ اب برہما بھی اتر آئیں تو مجھے منحرف نہیں کر سکتے۔ پنڈت امرناتھ کا کہنا میرے دل نشیں ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریما ہی نہیں کسی بھی دوشیزہ سے شادی کرنے کا حق مجھے نہیں ہے۔ ایشور نے وہ حق مجھ سے چھین لیا۔ پریما جیسی بیش بہا جنس کو پا کر چھوڑ دینے کا مجھے کتنا رنج ہو رہا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں اور کچھ کچھ تم بھی جانتے ہو۔مگر اس رنج میں خواہ میری جان ہی جاتی رہے جس کا کوئی امکان نہیں ہے، تو بھی اپنی اس زندگی میں پریما کو داخل نہ رہنے دوں گا۔اب تم میری طرف سے مطمئن ہو گئے؟‘‘

دان ناتھ اب بھی مطمئن نہ ہوئے تھے۔ ان کے دل میں ایک نہیں سیکڑوں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ یہ سمجھ کر کہ یہ نئی بات سن کر امرت رائے ہنس نہ پڑیں وہ خود ہنس کر بولے۔’’مجھ جیسے چھچھورے کو پریما قبول کرے گی، یہ بھی خیال آیا ہے آنجناب کو؟‘‘

امرت رائے نے زور سے قہقہہ لگایا۔’’بھئی واہ کیا بات سوچی ہے، مانتا ہوں! ارے احمق داس، جب لالہ بدری پرشاد نے

تمھارے یہاں پیغام بھیجا تو سمجھ لو کہ انھوں نے پریما سے دریافت کرلیا ہے۔ ایسا کیے بغیر وہ کبھی پیغام نہ بھیجتے۔ لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دینے کا کفّارہ تو انھیں ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ چند باتوں میں تو وہ ہم لوگوں سے بھی زیادہ فراخ دل ہیں، اور چند باتوں میں جہلا سے بھی پست تر۔ پردے سے انھیں چڑ ہے، یہ جانتے ہی ہو۔ بدھوا۔ اہ (بیاہ) ان کی آنکھوں میں بدترین اخلاقی گناہ ہے۔ تمھارا یہ اندیشہ تو بے بنیاد ثابت ہوا۔ ہاں یہ اندیشہ ہوسکتا ہے کہ پریما کو تم سے محبت نہ ہو۔ مگر ایسا خیال کرنا پریما کے ساتھ سخت ناانصافی کرنا ہے۔ وہ خاندانی رواج پر مٹنے والی سچی دیوی ہے۔ اس کی محبت کے معنیٰ ہی ہیں ''شوہر پرستی''۔ محبت کی کسی دوسری صورت سے وہ واقف ہی نہیں اور نہ شاید واقف ہوگی۔ مجھ سے اس کو اس لیے محبت تھی کہ وہ مجھے اپنا ہونے والا شوہر خیال کرتی تھی۔ پس اس کی محبت اس فرض شناسی پر محمول ہے۔ ایسے فضول اندیشوں میں مفت دن گزار رہے ہو۔ سہالگ نکل جائے گا تو پھر ایک سال امیدواری کرنی پڑے گی۔''

دان ناتھ فکر میں ڈوب گئے۔ اگرچہ ان کے اعتراضوں کی تردید ہوچکی تھی، مگر اب بھی ان کے دل میں ایسی متعدد باتیں تھیں جنھیں وہ ظاہر نہ کرسکتے تھے۔ شک دلیل سے دور ہوجانے پر بھی بالکل مٹ نہیں جاتا۔ دوست سے بے وفائی کا خیال ان کے دل میں کچھ اس قدر چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ اس پر کوئی حربہ کارگر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دفعتاً امرت رائے نے گھنٹی بجائی۔ ایک بوڑھا آدمی سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ امرت رائے نے بدری پرشاد کے نام ایک خط لکھا اور دان ناتھ سے بولے۔ ''اس پر دستخط کرو۔''

دان ناتھ دریچہ کے سامنے کھڑے سگار پی رہے تھے۔ پوچھا۔

''کیسا خط؟''

امرت – ''پڑھ لو سامنے تو ہے۔''

دان – ''تم میری گردن پر چھری چلا رہے ہو۔''

امرت – ''بس چپکے سے دستخط کردو۔ مجھے ایک جلسہ میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔''

دان – ''تو گولی ہی کیوں نہ ماردو کہ ہمیشہ کا جھنجھٹ مٹ جائے۔''

امرت – ''بس اب چیں چپڑ نہ کرو ورنہ یاد رکھو، پھر تمھاری صورت نہ دیکھوں گا۔ یہ دھمکی اپنا کام کرگئی۔ دان ناتھ نے خط پر دستخط کردیے اور تب بگڑ کر بولے۔ ''دیکھ لینا، میں آج سنکھیا کھا لیتا ہوں کہ نہیں، یہ خط دھرا ہی رہ جائے گا۔ سویرے ''رام نام ست'' ہوگا۔''

امرت رائے نے خط ایک لفافے میں بند کرکے بوڑھے کو دیا۔ بدری پرشاد کا نام سنتے ہی بوڑھا مسکرایا اور خط لے کر

© NCERT not to be republished

چلا گیا۔

تب امرت رائے نے ہنس کر کہا۔ ''سنکھیا نہ ہوتو میں دیدوں گا۔ ایک بار کسی دوا میں ڈالنے کے لیے منگوائی تھی۔''

دان ناتھ نے بگڑ کر کہا۔ ''میں تمھارا سر توڑ دوں گا، تم ہمیشہ سے مجھ پر حکومت کرتے آئے ہو اور اب بھی کرنا چاہتے ہو لیکن اب مجھ پر تمھارا کوئی داؤں نہ چلے گا۔ آخر میں بھی تو کوئی چیز ہوں۔''

امرت رائے اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

(7)

لالہ بدری پرشاد کو دان ناتھ کا خط کیا ملا۔ صدمے کے ساتھ ہی ذلت بھی ملی۔ وہ امرت رائے کی تحریر پہچانتے تھے۔ اس کی ساری عاجزی اور التجا اس تحریر میں گم ہوگئی۔ غصہ سے ان کا دماغ گرم ہوگیا۔ دان ناتھ کے کیا ہاتھ ٹوٹ گئے تھے، جو اس نے امرت رائے سے یہ خط لکھایا؟ کیا اس کے پیروں میں مہندی لگی تھی جو یہاں تک نہ آسکتا تھا اور یہ امرت رائے بھی کتنا بے حیا ہے! وہ ایسا خط کس طرح لکھ سکا۔ ذرا بھی شرم نہ آئی۔

اب تک لالہ بدری پرشاد کو کچھ کچھ امید تھی کہ شاید امرت رائے کا جوش میں کیا ہوا عہد کچھ مدھم پڑ جائے۔ تحریر دیکھ کر پہلے وہ یہی سمجھے تھے کہ امرت رائے نے معافی مانگی ہوگی لیکن خط پڑھا تو امید کا وہ باریک رشتہ بھی منقطع ہوگیا۔ دان ناتھ کا خط پا کر شاید وہ امرت رائے کو بلا کر دکھاتے اور ان کے جذباتِ حسد کو مشتعل کر کے اپنے پنجے میں لانے کی کوشش کرتے۔ اس امید کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ اس نے جلے پر نمک چھڑک دیا۔ امرت رائے کی تحریر دیکھ کر غصّے سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے دان ناتھ کو یہ خط لکھا۔

''لالہ دان ناتھ جی! آپ نے امرت رائے سے یہ خط لکھا کر میری اور پریما کی جتنی توہین کی ہے، اس کا آپ مطلق اندازہ نہیں کر سکتے۔ مناسب تو یہی تھا کہ میں اسے پھاڑ کر پھینک دیتا اور آپ کو کوئی جواب نہ دیتا لیکن ......''

یہیں تک لکھنے پائے تھے کہ دیوکی نے آکر بڑے شوق سے پوچھا۔ ''کیا لکھا ہے امرت رائے نے؟''

بدری پرشاد نے کاغذ کی طرف سر جھکائے ہوئے کہا۔ ''ان کا کوئی خط نہیں آیا۔''

دیوکی۔ ''چلو کوئی خط کیوں نہیں آیا۔ میں نے کوٹھے پر دیکھا، ان کا آدمی ایک خط لیے لپکا آرہا تھا۔''

بدری۔ ''ہاں آدمی تو ان ہی کا تھا مگر خط تھا دان ناتھ کا! اُسی کا جواب لکھ رہا ہوں۔ حضرت نے امرت رائے سے لکھوایا

ہے اور نیچے اپنے دستخط کر دیے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے لکھتے شرم آتی تھی۔ بے ہودہ، شہدہ۔''

دیوکی۔ ''خط میں تھا کیا؟''

بدری۔ ''یہ پڑا ہے۔ پڑھ کیوں نہیں لیتیں۔''

دیوکی نے خط پڑھ کر کہا۔ ''تو اس میں اتنا بگڑنے کی کون سی بات ہے؟ ذرا دیکھوں سرکار نے اس کا کیا جواب لکھا ہے؟''

بدری۔ لو دیکھو، ابھی تو شروع کیا ہے۔ ایسی خبر لوں گا کہ بچہ سارا شہدہ پن بھول جائے گا۔

دیوکی نے بدری پرشاد کا خط پڑھا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔

بدری پرشاد نے کڑک کر پوچھا ''پھاڑ کیوں ڈالا؟ تم کون ہوتی ہو میرا خط پھاڑنے والی؟''

دیوکی۔ تم کون ہوتے ہو ایسا خط لکھنے والے؟ امرت رائے کو کھو کر کیا ابھی بھر نہیں پایا۔ جواب دانو کو بھی کھو دینے کی فکر کرنے لگے۔ تمھارے خط کا نتیجہ یہی ہوگا کہ دانو پھر تمھیں اپنی صورت کبھی نہ دکھائے گا۔ زندگی تو میری لڑکی کی خراب ہوگی، تمھارا کیا بگڑے گا؟

بدری۔ ''ہاں اور کیا۔ لڑکی تو تمھاری ہے، میری تو کوئی ہوئی نہیں۔''

دیوکی۔ '' آپ کی کوئی ہوتی تو اسے کنویں میں ڈھکیلنے کو یوں تیار نہ ہو جاتے۔ یہاں دوسرا کون لڑکا ہے پریما کے لائق، ذرا سنوں۔''

بدری۔ ''دنیا لائق لڑکوں سے خالی نہیں ہے، ایک سے ایک بڑھ کر پڑے ہوئے ہیں۔''

دیوکی۔ ''پاس کے دو تین شہروں میں تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں باہر کی میں نہیں کہتی، ستو باندھ کر کھوجنے نکلو گے تو معلوم ہوگا۔ برسوں دوڑتے گزر جائیں گے، پھر بھی بے جانے پہچانے گھر میں لڑکی کون بیاہے گا اور پریما کیوں ماننے لگی۔''

بدری۔ ''اس نے اپنے ہاتھ سے کیوں خط نہیں لکھا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس سے میری کتنی توہین ہوئی۔ سارے امتحانات تو پاس کیے بیٹھا ہے، ڈاکٹر بھی ہونے جا رہا ہے۔ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم۔ صاف بات ہے کہ دونوں مل کر میری توہین کرنا چاہتے ہیں۔''

دیوکی۔ ''ہاں شہدے تو ہیں ہی، تمھاری توہین کرنے کے سوا اور ان کا کام ہی کیا ہے؟ صاف بات تو ہے اور تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ جانے عقل تقسیم ہوتے وقت تم کہاں چلے گئے تھے؟ پچاس کے ہوئے اور اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔''

بدری پرشاد نے ہنس کر کہا۔ ''میں تمھیں کھوجنے گیا تھا۔''

© NCERT not to be republished

دیوکی ادھیڑ ہونے پر بھی خوش مذاق تھی، بولی ''واہ میں پہلے ہی پہنچ کر کئی حصے اڑا لے گئی۔ دونوں میں کتنی دوستی ہے، یہ تو جانتے ہی ہو۔ دان ناتھ لحاظ سے خود نہ لکھ سکا ہوگا۔ امرت بابو نے سوچا ہوگا، کہ لالہ جی کوئی اور لڑکا نہ ٹھیک کرنے لگیں۔ اس لیے یہ خط دانو سے جبراً دستخط کرا لیے ہوں گے۔''

بدری پرشاد نے خفّت سے کہا۔ ''اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، کیا ایسا گنوار ہوں۔''

دیوکی۔ ''تب کس لیے اتنا جامہ سے باہر ہو رہے تھے؟ بلاکر کہہ دو منظور ہے۔ بیچاری بوڑھی ماں کے بھاگ کھل جائیں گے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔''

بدری۔ ''مجھے اب یہ افسوس ہو رہا ہے کہ پہلے ہی دانو سے کیوں نہ بیاہ کر دیا، اتنے دنوں تک کیوں امرت رائے کا منہ تاکتا رہا، آخر وہی کرنا پڑا۔''

دیوکی۔ ''تقدیر کو کون جانتا تھا اور حق تو یہ ہے کہ دانو نے پریما کے لیے تپسیا بھی بہت کی۔ چاہتا تو اب تک کبھی کی اس کی شادی ہوگئی ہوتی۔ کہاں سے پیغام نہیں آئے۔ رشتہ داروں نے کتنا سمجھایا مگر اس نے کبھی ہاں نہ کی۔ پریما اس کے دل میں بسی ہوئی ہے۔''

بدری۔ ''لیکن پریما اسے قبول کرے گی۔ پہلے یہ تجویز کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ میں یہاں منظور کرلوں اور پریما انکار کر دے۔ اس بارے میں اس کی منظوری لے لینی چاہیے۔''

دیوکی۔ ''پھر تم مجھے چڑھانے لگے۔ دانو میں کون سی برائی ہے جو وہ انکار کرے گی۔ لاکھوں میں ایک لڑکا ہے، ہاں یہ ضد ہو کہ کروں گی تو امرت رائے سے کروں گی ورنہ بے بیاہی رہوں گی، تو جنم بھر ان کے نام پر بیٹھی رہے۔ امرت رائے تو اب کسی بدھواہی سے بیاہ کرے گا۔ ممکن ہے بیاہ ہی نہ کرے، اس کا دید ہی دوسرا ہے۔ میری بات مانو۔ دانو کو خط لکھ دو۔ پریما سے پوچھنے جانچنے کا کام نہیں۔ دل ایسی چیز نہیں جو قابو میں نہ آجائے۔ میرا دل تو اپنے پڑوس کے وکیل صاحب سے کرنے کا تھا۔ انھیں کوٹ پتلون پہنے بگھی پر کچہری جاتے دیکھ کر میں خوش ہوجاتی تھی۔ مگر تمھارے نصیب جاگے، ماں باپ نے تمھارے پلّے باندھ دیا — تو میں نے کیا کیا۔ دو ایک دن تو ضرور رنج ہوا مگر پھر ان کی طرف خیال بھی نہ گیا۔ تم شکل وصورت، عقل وتمیز، دولت وثروت، کسی بات میں ان کی برابری نہ کرسکتے تھے مگر قسم لو جو میں نے شادی کے بعد کبھی بھولے سے ان کی یاد کی ہو۔''

بدری۔ ''اچھا جبھی تم بار بار مائیکے جایا کرتی تھیں!''

دیوکی۔ ''مجھے چھیڑو گے تو میں کچھ کہہ بیٹھوں گی۔''

© NCERT not to be republished

بدری۔ ’’تم نے اپنی بات کہہ ڈالی تو میں بھی کہے دیتا ہوں۔ میری بھی ایک عیسائی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔ میں عیسائی ہونے والا تھا۔ رنگ روپ میں پری تھی۔ تم اس کے پیروں کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ مجھے اب تک اس کی یاد ستاتی ہے۔‘‘

دیوکی۔ ’’جھوٹے کہیں کے! جب میں آئی تو مہینہ بھر تک تو تم مجھ سے بولتے شرماتے تھے۔ عیسائی عورت سے محبت کرتے تھے! وہ تو تمہیں بازار میں بیچ آتی! اور پھر تم لوگوں کی بات میں نہیں چلاتی، سچ بھی ہوسکتی ہے۔‘‘

بدری۔ ’’ذرا پریما کو بلا لو پوچھ لینا ہی اچھا ہے۔‘‘

دیوکی۔’’(جھنجھلا کر) اس سے کیا پوچھوگے، اور وہ کیا کہے گی۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھ سے جب اس بارے میں باتیں ہوتی ہیں وہ یہی کہتی رہی ہے کہ میں کنواری رہوں گی، وہی پھر کہے گی۔ مگر اتنا میں جانتی ہوں کہ جس کے ساتھ تم بات چیت پکّی کروگے اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اتنا وہ جانتی ہے کہ گرہست لڑکی کنواری نہیں رہ سکتی۔‘‘

بدری۔ ’’رو رو کر جان تو نہ دے گی؟‘‘

دیوکی۔ ’’نہیں میں ایسا نہیں سمجھتی! فرض کا اسے بڑا خیال رہتا ہے اور یوں تو پھر دکھ ہی ہے جسے دل میں اپنا سوامی سمجھ چکی تھی، اسے دل سے نکال کر پھینک دینا کوئی سہل کام ہے؟ یہ زخم کہیں برسوں میں بھرے گا۔ اس سال وہ بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوگی۔‘‘

بدری۔ ’’اچھا میں ابھی آیا۔ پورنا سے پوچھوں— ان پڑھی لکھی لڑکیوں کا مزاج کچھ اور ہی ہوجاتا ہے۔ اگر فرض اور محبت میں مخالفت ہوگئی تو ان کی ساری زندگی ہی رنج میں گذرتی ہے وہ محبت اور فرض پر ایثار کرنا نہیں جانتیں یا نہیں چاہتیں۔ ہاں محبت اور فرض میں میل ہوجائے تو ان کی زندگی اعلیٰ زندگی ہوجاتی ہے۔ ایسا ہی مزاج پریما کا معلوم ہوتا ہے۔ میں دانو کو لکھے دیتا ہوں کہ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ مگر پریما سے پوچھ کر ہی تصفیہ کرسکوں گا۔‘‘

دفعتاً کملا پرشاد آکر بولے۔ ’’آپ نے کچھ سنا ہے؟ بابو امرت رائے تو ایک بدھوا آشرم کھولنے جارہے ہیں۔ کمانے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے۔‘‘

بدری پرشاد نے ذرا چیں بہ جبیں ہوکر پوچھا۔ ’’کمانے کا یہ ڈھنگ کیسا؟ میں نہیں سمجھا۔‘‘

کملا۔ ’’وہی جو اور لیڈر کرتے ہیں۔ آشرم میں بیواؤں کی پرورش و پرواخت کی جائے گی، انھیں تعلیم بھی دی جائے گی۔ چندے کی رقمیں آئیں گی اور یار لوگ مزے کریں گے۔ کون جانتا ہے، کہاں سے کتنے روپے آئے، پھر مہینے بھر میں ایک جھوٹا سچا حساب چھپوا دیا۔ سنا ہے کئی رؤسا نے بڑے بڑے چندے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پانچ لاکھ کا تخمینہ ہے۔ اس میں کم از کم پچاس ہزار تو یاروں کے ہیں! وکالت میں اتنے روپے اتنی جلدی کہاں ملے جاتے تھے؟‘‘

بدری – ’’پچاس ہزار ہی بنائے تو کیا بنائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک لاکھ سے کم پر ہاتھ صاف نہ کریں گے۔‘‘

کملا – ’’ان لوگوں کو سوجھتی خوب ہے، ایسی باتیں ہم لوگوں کو نہیں سوجھتے۔‘‘

بدری – ’’جا کر دونوں ان کی شاگردی کرو۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔‘‘

کملا – ’’تو کیا میں کچھ کہتا ہوں۔‘‘

بدری – ’’ذرا بھی نہیں، تم کبھی جھوٹ بولے ہی نہیں۔ بھلا آج کیوں جھوٹ بولنے لگے۔ سچائی کے اوتار تمھیں تو ہو۔‘‘

دیوکی – ’’سچ کہا ہے کہ ہَوَن کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ وہ بے چارا تو اُپکار کے لیے اپنا سب کچھ ہَوَن کیے بیٹھا ہے اور تمھاری نگاہوں میں اس نے دنیا والوں کو ٹھگنے کے لیے ایک سوانگ رچا ہے! آپ تو کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسروں کے بھلے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کو تیار! انھیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے جو یہ ڈھونگ رچتے؟‘‘

کملا – ’’اچھا میں ہی جھوٹا سہی۔ اس میں جھگڑا کا ہے کا؟ تھوڑے دنوں میں آپ ہی قلعی کھل جائے گی۔ آپ جیسے سیدھے سادے لوگ دنیا میں نہ ہوتے تو ایسے مکّاروں کی تھیلیاں کون بھرتا؟‘‘

دیوکی – ’’بس چپ بھی رہو۔ ایسی باتیں تمھیں منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی۔ کہیں پریما کے سامنے ایسی بے سرپیر کی باتیں نہ کرنے لگنا۔ یاد ہے کہ تم نے ایک بار امرت رائے کو جھوٹا کہا تھا تو اس نے تین دن تک کھانا نہیں کھایا تھا۔‘‘

کملا – ’’یہاں ان باتوں سے نہیں ڈرتے، خوشامد کی باتیں کرنا مجھے نہیں آتا۔ کہوں گا سچ ہی، چاہے کسی کو بھلا لگے یا برا۔ وہ ہماری توہین کرتے ہیں تو ہم ان کی پوجا نہ کریں گے۔ آخر وہ ہمارے کون ہوتے ہیں جو ہم ان کے کرتوتوں پر پردہ ڈالیں؟ میں انھیں اتنا بدنام کروں گا کہ سارے شہر میں کسی کو منہ نہ دکھا سکیں گے۔‘‘

یہ کہتا ہوا کملا چلا گیا۔ اسی وقت پریما نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی پلکیں نم تھیں۔ گویا ابھی روتی رہی ہو۔ اس کا نازک جسم ایسا لاغر ہو گیا تھا گویا کسی نغمہ کی آوازِ بازگشت ہو۔ چہرہ کسی ہجراں نصیب کی یادِ ماضی کی طرح نحیف اور اداس تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ’’داداجی‘‘ آپ ذرا بابو دان ناتھ کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ کیوں جیجا پر جھوٹا الزام لگاتے پھرتے ہیں۔‘‘

بدری پرشاد نے متحیر ہو کر کہا۔ ’’دان ناتھ! وہ بھلا کیوں امرت رائے پر حملہ کرنے لگے۔ ان میں جیسی دوستی ہے ویسی تو میں نے اور کہیں دیکھی ہی نہیں۔‘‘ پریما۔ ’’یقین تو مجھے بھی نہیں آتا مگر بھیا جی یہی کہہ رہے ہیں۔ بدھوا آشرم کھولنے کا جیجا جی کا بہت دنوں سے ارادہ تھا۔ کئی بار مجھ سے اس کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے لیکن بابو دان ناتھ اب یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اس چندہ سے روپیہ جمع کر کے زمینداری خریدنا چاہتے ہیں۔‘‘

© NCERT not to be republished

بدری ۔ ''کملا کہتے تھے؟''

پریما ۔ ''ہاں بھیاجی کہتے تھے۔ دان ناتھ نے ان سے کہا ہوتو تعجب ہی کیا ہے۔''

بدری ۔ ''کملا جھوٹ بول رہا ہے، سراسر جھوٹ، دانو کو میں خوب جانتا ہوں اس کا سا شریف آدمی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ آج امرت رائے کے نفع کے لیے جان دینے کا موقع آجائے تو دانو شوق سے اپنی جان قربان کردے گا۔ آدمی کیا ہیرا ہے۔ مجھ سے جب ملتا ہے بڑی عاجزی سے پیر چھو لیتا ہے۔''

دیوکی ۔ ''کتنا ہنس مکھ ہے، میں نے اسے جب دیکھا ہنستے ہی دیکھا۔ بالکل بچوں کا مزاج ہے۔ اس کی ماں رویا کرتی ہے کہ میں مرجاؤں گی تو دانو کو کون کھلا پلا کر سلائے گا؟ دن بھر بھوکا بیٹھا رہے گا۔ مگر کھانا نہ مانگے گا اور اگر کوئی بلا بلا کر کھلائے تو تمام دن کھاتا ہی رہے گا۔ بڑی سادہ طبیعت کا ہے۔ غرور تو چھو بھی نہیں گیا۔''

بدری ۔ ''اب کے ڈاکٹر ہو جائے گا۔''

لالہ بدری پرشاد ان آدمیوں میں تھے جو دُبدھے میں نہیں رہنا چاہتے۔ کسی نہ کسی فیصلہ پر پہنچ جانا ان کے دلی اطمینان کے لیے ضروری تھا۔ دان ناتھ کے خط کا تذکرہ کرنے کا ایسا نادر موقعہ پاکر وہ ضبط نہ کر سکے۔ بولے۔ ''یہ دیکھو! پریما: دانو نے ابھی ابھی یہ خط بھیجا ہے۔ میں تم سے مشورہ کرنے جا ہی رہا تھا کہ تم خود ہی یہاں آگئیں۔''

خط کا مطلب کیا ہے، پریما اسے فوراً تاڑ گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لے لیا۔ مگر تحریر دیکھی تو صاف امرت رائے کی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

تحریر دیکھ کر ایک دن اس کا دل کتنا خوش ہو جاتا تھا۔ آج وہی تحریر اس کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگی۔ ایک ایک لفظ بچھو کی طرح اس کے دل پر ڈنک مارنے لگا۔ اس نے خط لے کر دیکھا۔ وہی تحریر تھی۔ وہی اس کی جانی بوجھی خوشنما صاف تحریر، جو دلی اطمینان کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مطلب وہی تھا جو پریما نے سمجھا تھا۔ وہ اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔ اسے یقین تھا کہ دان ناتھ اس موقع پر نہ چوکیں گے۔ اس نے خط کا جواب پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا، شکریہ کے ساتھ، صاف انکار مگر یہ امرت رائے کے قلم سے نکلے گا، جس کا امکان ہی اس کے وہم وگمان سے باہر تھا۔ امرت رائے اتنے بے درد ہیں، اس کا اسے خیال بھی نہ ہوسکتا تھا۔ وہی دل جو امرت رائے کے ساتھ مصیبت کے سخت ترین صدمے اور آفتوں کی ناقابل برداشت تکلیفیں سہنے کو تیار تھا، آج اس بے اعتنائی کی ٹھیس نہ سہہ سکا۔ وہ بے مثال محبت، وہ غیر محدود عقیدت جو پریما نے ان میں برسوں سے مرکوز کر رکھی تھی، ایک آہِ سرد کے ساتھ جاتی رہی۔ اسے معلوم ہوا گویا اس کے سارے اعضا سست پڑ گئے ہیں۔ گویا دل بھی ساکت ہو گیا ہے۔ گویا اس کی اپنی

زبان پر بھی بالکل قابو نہیں ہے۔ اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل پڑے۔ ''آپ کی جو مرضی ہو کیجیے، مجھے سب منظور ہے۔'' وہ کہنے جا رہی تھی، جب کنوئیں میں گرنا ہی ہے تو جیسے کچا ویسے پکا، اس میں کوئی فرق نہیں، مگر جیسے اس کو کسی نے خبردار کر دیا۔ وہ فوراً خط کو وہیں پھینک کر اپنے کمرہ میں لوٹ آئی اور دریچے کے سامنے کھڑی ہو کر زاروقطار رونے لگی۔

شام ہو گئی تھی، آسمان میں ایک ایک کر کے تارے نکلتے آتے تھے۔ پریما کے دل میں اسی طرح ایک ایک کر کے یادداشتیں آنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان تاروں سے جگمگا اٹھا۔ پریما کا دل بھی یادداشتوں سے بندھ گیا۔ مگر ان بے شمار تاروں سے آسمان کی تاریکی کیا اور بھی گہری نہیں ہو گئی تھی۔

بیساکھ میں پریما کی شادی دان ناتھ کے ساتھ ہو گئی۔ بڑی دھوم دھام رہی۔ کُل شہر کے روسا کو مدعو کیا گیا۔ لالہ بدری پرشاد نے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائی۔ مگر دان ناتھ کی طرف سے کوئی تیاری نہ تھی۔ امرت رائے چندہ کی فراہمی کے لیے بہار کی طرف چلے گئے تھے اور تاکید کر گئے تھے، ''دھوم دھام مت کرنا۔'' دان ناتھ ان کی مرضی کے خلاف کیسے چلتے۔

ادھر پورنا کے آنے سے سومترا کو گویا آنکھیں مل گئیں۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے سے سومترا کو سیری نہ ہوتی۔ آدھی رات تک اپنا دکھڑا سنایا کرتی۔ زندگی میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ شوہر کی بے رخی روز ہی اس کے دل میں چبھا کرتی تھی، اس بے رخی کا سبب کیا ہے، یہ مسئلہ اس سے حل نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت نہ تھی، پھر بھی اسے کوئی بدصورت نہ کہہ سکتا تھا۔ بناؤ سنگھار کا تو اسے مرض سا ہو گیا تھا۔ شوہر کے دل لبھانے کے لیے وہ نت نیا سنگھار کرتی تھی اور مقصد براری نہ ہونے سے اس کے دل میں آگ سی جلتی تھی! گھی کے چھینٹوں سے بھڑکنا تو آگ کے لیے قدرتی تھا۔ وہ پانی کے چھینٹوں سے بھی بھڑکتی تھی! کملا پرشاد جب اسے اپنی محبت جتاتے تو اس کے دل میں آتا کہ سینے میں چھری مارلوں — زخموں میں یونہی کیا کم درد ہوتا ہے کہ کوئی اس پر نمک چھڑکے؟ آج سے تین برس پہلے سومترا نے کملا کو پا کر اپنے کو دھنیہ مانا تھا۔ دو تین مہینے اس کے سکھ سے کٹے، مگر جوں جوں ہر دو طبائع کا تضاد آشکارا ہونے لگا، دونوں ایک دوسرے سے کھینچنے لگے۔ سومترا فیاض تھی، کملا اعلیٰ درجہ کا ممسک! وہ پیسہ کو ٹھیکری سمجھتی تھی، کملا کوڑیوں کو دانت سے پکڑتا تھا۔ سومترا عموماً فقیروں کو بھیک دینے جاتی تو اتنا دیتی کہ وہ ''چٹکی'' کی انتہائی حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔ اس کے مائیکے سے ایک مرتبہ برہمنی کوئی خوش خبری لے آئی تھی، اسے اٹھا کر نئی ریشمی ساڑھی دے دی۔ ادھر کملا کا یہ حال تھا کہ فقیر کی آواز سنتے ہی گرج اٹھتے تھے۔ رول اٹھا کر مارنے دوڑتے تھے۔ دو چار کو پیٹ بھی دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ دروازہ پر جا کر کسی فقیر کی اگر کملا پرشاد کی مڈبھیڑ ہو گئی تو اسے دوسری مرتبہ وہاں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سومترا میں انکسار اور رحم تھا۔ کملا میں گھمنڈ، چھچھورا پن اور خود غرضی۔ ایک آسمان پر کا جاندار تھا اور دوسرا زمین پر رینگنے والا، ان میں میل کیسے ہو؟

دان ناتھ نے آ کر کہا۔ ’’کملا!‘‘

پورنا کی آمد سے کملا اور سومترا ایک دوسرے سے اور بھی علاحدہ ہوگئے۔ سومترا کے دل کا بوجھ ہلکا سا ہوگیا۔ یہاں تو وہ دن کا دن بے پروائی سے پلنگ پر پڑے رہنے میں گذار دیتی، کہاں اب وہ ہر وقت ہنستی بولتی رہتی، کملا کی اس نے پرواہی کرنا چھوڑ دی۔ وہ کب گھر میں آتا ہے اور کب جاتا ہے۔ کب کھاتا ہے اور سوتا ہے۔ ان باتوں کی اسے ذرا بھی فکر نہ رہی۔ کملا پرشاد بدقماش نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اس میں خواہ کتنے ہی عیوب ہوں مگر عیاشی کا عیب نہ تھا۔ کسی عورت پر تاک جھانک کرتے اسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ پھر پورنا کے حسن نے اسے کس طرح گرویدہ کرلیا، یہ راز کون سمجھ سکتا ہے؟ شاید پورنا کی سادگی، عاجزی اور بے کسی نے کملا کی نفسیاتی خواہشوں کو متحرک کردیا۔ اس کی کنجوسی اور بزدلی ہی اس کے اخلاق کی بنیاد تھی۔ عیاشی گراں چیز ہے۔ جیب کے روپے خرچ کرکے بھی کسی آفت میں مبتلا ہوجانے کا جہاں ہر لمحہ امکان ہو، ایسے کام میں کملا پرشاد جیسا ہوشیار آدمی نہ پڑ سکتا تھا۔ پورنا کے بارے میں اسے کوئی تردّد نہ تھا وہ اتنی سیدھی سادی تھی کہ اسے قابو میں لانے کے لیے کسی بڑی ریاضت کی ضرورت نہ تھی۔ اور پھر یہاں تو نہ کسی کا خوف تھا نہ پھنسنے کا اندیشہ اور نہ مار کھانے کا خیال۔ پورنا کی بے کسی نے ان تمام اندیشوں کو غیر مسلّح بنادیا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اب اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ صرف گھر والوں کی آنکھ بچالینا کافی ہوگا اور یہ بات کچھ مشکل نہ تھی مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ پیدا ہوگئی اور وہ سومترا تھی! سومترا پورنا کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چھوڑتی تھی۔ دونوں کھانا کھانے ساتھ جاتیں۔ چھت پر دیکھو تو ساتھ۔ کمرے میں دیکھو تو ساتھ، رات کو ساتھ، دن کو بھی دونوں ساتھ ہی ساتھ سوجاتیں۔ کملا جب خواب گاہ میں جاکر سومترا کا انتظار کرتا کرتا سوجاتا تو نہ جانے کب وہ اس کے پاس آجاتی۔ پورنا سے تنہائی میں کوئی بات کرنے کا اسے موقع نہ ملتا تھا۔ وہ دل میں سومترا پر جھنجھلا کر رہ جاتا۔ آخر ایک روز اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ رات کو جب سومترا آئی تو اس نے کہا:

’’تم رات دن پورنا کے پاس کیوں بیٹھی رہتی ہو؟ وہ اپنے دل میں سمجھتی ہوگی کہ یہ تو اچھی بلا گلے پڑی۔ ایسی تو بڑی سمجھدار بھی نہیں ہو کہ تمھاری باتوں میں اسے مزا آتا ہو، تمھاری بے وقوفی پر ہنستی ہوگی۔‘‘

سومترا نے کہا۔ ’’اکیلی پڑی پڑی کیا کروں؟ یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا کہ میں آرام سے سوؤں اور وہ اکیلی رویا کرے، اٹھنا بھی چاہتی ہوں تو وہ لپٹ جاتی ہے۔ چھوڑتی ہی نہیں، دل میں میری بے وقوفی پر ہنستی ہے یا نہیں، یہ کون جانے؟ مگر میرا ساتھ اسے اچھا نہ لگتا ہو، یہ بات نہیں۔‘‘

کملا۔ ’’تمھیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس کی اور تمھاری کوئی برابری نہیں۔ وہ تمھاری سہیلی بننے کے قابل نہیں ہے۔‘‘

سومترا۔ ’’میں ایسا نہیں سمجھتی۔‘‘

کملا۔ ’’تمھیں اتنی سمجھ ہی نہیں۔ سمجھو گی کیا؟‘‘

سومترا۔ ’’ایسی سمجھ کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔‘‘

اس روز سے سومترا سائے کی طرح پورنا کے ساتھ رہنے لگی۔

کملا پرشاد کے طریقوں میں اب ایک عجیب تبدیلی سی ہوتی جاتی تھی۔ سنیما دیکھنے کا اب اسے شوق نہ تھا۔ نوکروں پر ڈانٹ پھٹکار بھی کم ہوگئی۔ کچھ فراخ دست بھی ہوگیا۔ ایک روز بازار سے بنگلہ مٹھائی لایا۔ سومترا کو دیتے ہوئے کہا۔ ’’ذرا اپنی سکھی کو چکھانا‘‘ سومترا نے مٹھائی لے لی مگر پورنا سے اس کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے روز کملا نے پوچھا۔ ’’پورنا نے مٹھائی پسند کی ہوگی۔؟‘‘ سومترا نے جواب دیا۔ بالکل نہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے مٹھائی سے کبھی رغبت نہیں رہی۔‘‘

کئی روز کے بعد ایک روز کملا پرشاد دو ریشمی ساڑھیاں لائے اور بے دھڑک اپنے کمرے میں گھس گئے۔ دونوں سہیلیاں ایک ہی پلنگ پر لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پورنا کا سر کھلا ہوا تھا۔ شرم کے مارے اس کے جسم میں پسینہ آ گیا۔ سومترا نے شوہر کی طرف غصہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

کملا نے کہا۔ ’’ارے پورنا بھی یہیں ہیں۔ معاف کرنا پورنا مجھے معلوم نہ تھا۔ یہ دیکھو سومترا، دو ساڑیاں لایا ہوں۔ سستے داموں میں مل گئیں۔ ایک تم لے لو اور ایک پورنا کو دے دو۔‘‘

سومترا نے ساڑیوں کو بے چھوئے ہی کہا، ان کی تو آج کوئی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس ساڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور پورنا ریشمی ساڑیاں پہننا چاہیں گی تو میں اپنی نئی ساڑیوں میں سے ایک دے دوں گی۔ ’’کیوں بہن! ان میں سے لوگی کوئی ساڑی؟‘‘

پورنا نے سر ہلا کر کہا۔ ’’نہیں، ریشمی لے کر کیا کروں گی؟‘‘

کملا ۔ ’’کیوں ریشمی ساڑی تو کوئی چھوت کی چیز نہیں۔‘‘

سومترا ۔ ’’چھوت کی چیز نہیں مگر شوق کی چیز تو ہے۔ سب سے پہلے تو تمھاری والدہ ماجدہ ہی چھاتی پیٹنے لگیں گی۔‘‘

کملا ۔ ’’مگر اب تو میں لوٹانے نہ جاؤں گا۔ بزاز سمجھے گا دام سن کر ڈر گئے۔‘‘

سومترا ۔ ’’بہت اچھی ہوں تو پریما کے پاس بھیج دوں۔ تمھاری خریدی ہوئی ساڑھی پا کر اپنا بھاگ سراہیں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کہیں کوئی رقم مفت ہاتھ آ گئی ہے۔ سچ کہنا کس کی گردن ریتی ہے؟ گانٹھ کے روپے خرچ کر کے تم ایسی بے کار چیز کبھی نہ لیتے ہوگے۔‘‘ کملا نے غضب آلود نگاہوں سے سومترا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’تمھارے باپ کی تجوری توڑی ہے اور بھلا کہاں

ڈاکہ ڈالنے جاتا؟''

سومترا - ''مانگتے تو وہ یوں بھی دے دیتے۔ تجوری توڑنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر عادت کو کیا کرو۔''

کملا نے پورنا کی طرف منہ کرکے کہا۔ ''سنتی ہو پورنا، ان کی باتیں! شوہر سے باتیں کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ تم بھی انھیں نہیں سمجھاتیں۔ اور کچھ نہ سہی تو آدمی سیدھے منہ بات تو کرے۔ جب سے تم آئی ہو ان کا دماغ اور بھی آسمان پر چڑھ گیا ہے۔''

پورنا کو سومترا کی سختی بری معلوم ہو رہی تھی۔ تنہائی میں کملا پرشاد سومترا کو جلاتے ہوں، مگر اس وقت سومترا ہی انھیں جلا رہی تھی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کملا مجھ سے ناراض ہو گئے تو مجھے اس گھر سے نکلنا پڑے گا۔ کملا کو ناراض کرکے یہاں ایک دن بھی نباہ نہیں ہو سکتا، وہ یہ جانتی تھی اس لیے وہ سومترا کو سمجھاتی رہتی تھی، بولی۔ ''میں تو برابر سمجھایا کرتی ہوں۔ بابوجی پوچھ لیجیے۔ جھوٹ کہتی ہوں۔''

سومترا نے تیز لہجہ میں کہا۔ ''ان کے آنے سے میرا دماغ کیوں آسمان پر چڑھ گیا، ذرا یہ بھی بتادو، مجھے انھوں نے راج گدّی پر نہیں بٹھادیا تھا۔ ہاں تب اکیلی پڑی رہتی تھی۔ اب گھڑی دو گھڑی ان کے ساتھ بیٹھ لیتی ہوں۔ کیا تم سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا؟''

کملا - ''تم فضول بات بڑھاتی ہو سومترا! میں یہ کب کہتا ہوں کہ تم ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ترک کردو۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔''

سومترا - ''اور کہنے کا مطلب ہی کیا ہے کہ جب سے یہ آئی ہیں، تمھارا دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے؟''

کملا - ''کچھ جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ پورنا خود دیکھ رہی ہیں۔ تمھیں ان کی نیک صحبت سے کچھ اچھی باتیں سیکھنی چاہیے تھیں۔ یہاں انھیں لاکر رکھنے میں میرا ایک مقصد یہ بھی تھا مگر تم پر ان کی صحبت کا الٹا ہی اثر ہوا۔ یہ بیچاری سمجھاتی ہوں گی مگر تم کیوں ماننے لگیں؟ جب تم مجھی کو کچھ نہیں گنتیں تو یہ بے چاری کس گنتی میں ہیں؟ بھگوان سب کچھ دے مگر برے کا ساتھ نہ دے۔ تم ان میں سے ایک ساڑھی رکھ لو پورنا۔ دوسری میں پریما کے پاس بھیجے دیتا ہوں۔''

سومترا نے دونوں ساڑیوں کو اٹھاکر دروازہ کی طرف پھینک دیا۔ دونوں کاغذ میں تہہ کی ہوئی رکھی تھیں۔ صحن میں جاکر گریں۔ مہری اس وقت صحن دھو رہی تھی، جب تک وہ دوڑ کر ساڑیاں اٹھائے، کاغذ بھیگ گیا اور ساڑیوں میں داغ پڑ گئے۔ پورنا نے حقارت کے لہجہ میں کہا۔ ''بہن دیکھو تو ساڑیاں خراب ہو گئیں۔''

کملا - ''ان کی کرتوتیں دیکھتی جاؤ۔ اس پر میں ہی برا ہوں۔ مجھی میں دنیا بھر کے عیب ہیں۔''

سومترا - ''تو لے کیوں نہیں جاتے اپنی ساڑیاں؟''

کملا ۔ ’’میں تمھیں تو نہیں دیتا۔‘‘

سومترا ۔ ’’پورنا بھی نہ لیں گی۔‘‘

کملا ۔ ’’تم ان کی طرف سے بولنے والی کون ہوتی ہو؟ تم نے اپنا ٹھیکہ لیا ہے یا زمانے بھر کا؟ بولو پورنا، ایک رکھ دوں نا؟ یہ سمجھ لو کہ تم نے انکار کر دیا تو مجھے بڑا رنج ہوگا۔‘‘

پورنا بڑے شش و پنج میں پڑ گئی، اگر ساڑی لیتی ہے تو سومترا کو برا لگتا ہے، اگر نہیں لیتی تو کملا برا مانتے ہیں۔ سومترا! کیوں اتنی ہٹ کر رہی ہے۔ کیوں اتنا جامے سے باہر ہو رہی ہے، یہ بھی اس سے پوشیدہ نہ رہا۔ دونوں پہلوؤں پر غور کر کے اب اس نے سومترا ہی کو خوش رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ کملا روٹھ کر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، زیادہ سے زیادہ اسے یہاں سے چلا جانا پڑے گا۔ سومترا ناراض ہو گئی تو نہ جانے کیا غضب ڈھائے، نہ جانے اس کے دل میں کیسے کیسے برے خیالات پیدا ہوں، بولی: ’’بابو جی ریشمی ساڑیاں پہننے کی مجھے مناہی ہے، تو لے کر کیا کروں گی؟ ایسا ہی ہے تو کوئی موٹی مہین دھوتی لا دیجیے گا۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے کملا پرشاد کی طرف معذور نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کتنی عاجزی، کتنی معذوری بھری ہوئی تھی گویا وہ کہہ رہی تھیں کہ لینا تو چاہتی ہوں مگر لوں کیسے؟ انھیں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کیا گھر سے نکالنے کی خواہش ہے؟

کملا پرشاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ساڑیاں چپکے سے اٹھا لیں اور پیر پٹکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

(پریم چند)

مشق

سوالات

1. پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات پر ایک تنقیدی مضمون لکھیے۔
2. ناول ”بیوہ“ کے اہم کردار کون سے ہیں اور پریم چند ان کی عکاسی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟
3. ناول ”بیوہ“ کے ذریعے پریم چند ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

© NCERT not to be republished

ڈراما

عالمی ادب میں صنفِ ڈراما کو ہمیشہ سے بلند مقام حاصل رہا ہے۔ وہ ہندوستان ہو، یونان ہو یا برطانیہ، ہر جگہ اس صنف کی پذیرائی اور ترقی ہوئی ہے۔ ڈرامے کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر اس کی ایک سادہ سی تعریف یہ ہے کہ ''ڈراما کسی قصّے یا واقعے کو اداکاروں کے ذریعے، ناظرین کے روبرو عملاً پیش کرنے کا نام ہے۔'' اس سے واضح ہوا کہ ڈراما ناول یا افسانے کی طرح صرف لکھے یا پڑھے جانے تک محدود نہیں۔ اس کے لیے پیش کش ضروری ہے بلکہ یہ مکمل ہی تب ہوتا ہے جب اسے عملاً اسٹیج پر پیش کر دیا جائے۔ ناول اور افسانے کی طرح ڈرامے میں بھی پلاٹ، کردار، مکالمہ اور کوئی نہ کوئی مرکزی خیال ہوتا ہے۔ مگر قصّے کی عملی پیش کش ہی اسے ناول اور افسانے سے ممیّز کرتی ہے۔

بنیادی طور پر ڈرامے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1۔ٹریجڈی (المیہ) 2۔کامیڈی (طربیہ)۔ اِن دونوں عناصر، یعنی الم وطرب کے امتزاج سے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ اس طرح المیہ طربیہ وجود میں آیا۔ اس کے علاوہ ''میلو ڈراما''، ''فارس''، ''ڈریم'' اور ''اوپیرا'' بھی ڈرامے کی اقسام میں شامل ہیں۔

اردو ڈرامے کی ابتدا 1844 سے 1855 کے دوران واجد علی شاہ کی ڈرامائی پیش کش اور امانت و مداری لال کی اندرسبھاؤں سے لکھنؤ میں ہوئی۔ مگر اسے عروج حاصل ہوا پارسی اسٹیج کے ڈراموں سے۔ جس زمانہ میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں اندرسبھاؤں کی دھوم مچی ہوئی تھی، اسی زمانے میں ممبئی میں مغربی اثرات کے تحت ایک نئے قسم کا ڈراما وجود میں آ رہا تھا جسے پارسی اسٹیج کا نام دیا گیا۔ یہ نام اسے اس لیے دیا گیا کیونکہ اس کی ابتدا اور ترقی میں پارسیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

پارسی اسٹیج کا پہلا ڈراما ''خورشید'' ہے جسے 1870 میں ایدل جی گھوری نے لکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی کچھ ڈرامے لکھے گئے مگر وہ دستیاب نہیں ہیں۔ پارسی اسٹیج کے ڈرامے بھی ابتدائی اردو ڈراموں کی طرح منظوم ہوتے تھے۔ ان میں رقص، موسیقی اور گانوں کا استعمال بھی ویسا ہی تھا۔ قصے اور کردار بھی فوق فطری ہوتے تھے مگر پیش کش کا انداز ابتدائی ڈراموں سے مختلف تھا۔ ''پروسینیم'' یعنی آگے گرنے والے پردے کا استعمال پارسی اسٹیج سے شروع ہوا۔ اب اسٹیج کی پچھلی دیوار پر سین سینریوں والے پردے لگائے جانے لگے۔ ہر ذیلی سین پر بھی پردہ گرنے اور اٹھنے لگا۔ اسٹیج پر طرح طرح کی مشینوں کا استعمال ہونے لگا۔ مکالموں میں دھیرے دھیرے نثر کا استعمال بڑھا۔ گانے کم ہو گئے۔ فوق فطری واقعات اور کرداروں کے بجائے روزمرّہ زندگی کے واقعات اور مسائل ڈرامے کا موضوع بننے لگے۔

© NCERT not to be republished

آغا حشر کاشمیری

1876/1879 تا 1931/1935

آغا حشر اتر پردیش کے شہر بنارس میں پیدا ہوئے، اصل نام محمد شاہ تھا۔ آغا حشر نے عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بعد میں انگریزی تعلیم کے لیے اسکول بھی بھیجے گئے مگر پڑھنے لکھنے سے زیادہ ان کا دل سیر و تفریح اور شعر و شاعری کی محفلوں میں لگتا تھا۔ وہ بہت ذہین تھے۔ جو کچھ پڑھتے حرف بہ حرف یاد ہو جاتا تھا۔

اس دور میں پارسی تھیٹر کی کمپنیاں شہر شہر گھوم کر ڈرامے دکھایا کرتی تھیں۔ 1897 میں ''الفریڈ جوبلی کمپنی'' بنارس پہنچی۔ اس کے اہم ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے۔ آغا حشر ڈرامے دیکھنے جاتے تو احسن سے ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک روز کسی بات پر احسن سے الجھ گئے اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ ایسے ڈرامے تو میں ایک ہفتے میں لکھ سکتا ہوں۔ لہٰذا اپنا پہلا ڈراما ''آفتاب محبت'' لکھا جو 1897 میں بنارس کے ''جواہر اکسیر پریس'' سے شائع ہوا۔ اس ڈرامے کی اشاعت سے ان کی بہت ہمّت افزائی ہوئی۔

ڈراما نگاری کے شوق میں آغا حشر بمبئی پہنچے تو وہاں ان کا مقابلہ بڑے بڑے تجربہ کار ڈراما نگاروں سے تھا۔ چنانچہ انھوں نے ڈرامے لکھنے اور ادبی و علمی لیاقت بڑھانے کے لیے خوب محنت کی۔ انھیں ڈراما نگاری کی حیثیت سے پہلی نوکری ''الفریڈ تھیٹریکل کمپنی'' میں ہی ملی، جس کے لیے انھوں نے پہلا ڈراما ''مرید شک'' لکھا۔ اس کی مقبولیت نے آغا حشر کو بہت جلد شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور یہ شہرت روز بروز بڑھتی گئی۔

فلمی کہانیوں کو شامل کر کے ان کے ڈراموں کی کل تعداد اڑتیس (38) ہے۔ ان کے ڈراموں میں تین طرح کے پلاٹ پائے جاتے ہیں۔ پہلے وہ جو مغربی ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ دوسرے وہ جو تاریخی یا نیم تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ تیسرے وہ جو سماجی اور اصلاحی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔

''یہودی کی لڑکی'' آغا حشر نے 1913 میں لکھا۔ یہ اُن کے سب سے زیادہ مقبول ڈراموں میں شامل ہے۔ آغا حشر نے اس میں بظاہر رومن سلطنت اور یہودی قوم کے درمیان کش مکش دکھائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودی قوم اور رومن مذہبی پیشوا

© NCERT not to be republished

کے پردے میں انگریزی حکومت اور ہندوستانی عوام کے درمیان جاری کش مکش کو پیش کیا گیا ہے۔اس طرح براہ راست مفہوم کے ساتھ ساتھ اس ڈرامے کا ایک علامتی مفہوم بھی نکلتا ہے۔

اس ڈرامے میں کردار نگاری اوسط درجے کی ہے، کوئی ایسا کردار نہیں جو ہمارے دلوں پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑ جائے۔ پھر بھی، وقتی طور پر، اس کے کردار ہمیں متاثر ضرور کرتے ہیں۔ اس میں مکالمے چھوٹے اور برجستہ ہیں، جن میں گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔ زبان سلیس اور رواں ہے۔ جو بات نثر میں کہی جاتی ہے، آغا حشر اس میں زور پیدا کرنے کے لیے اسے شعر میں بھی دہراتے ہیں۔ یہ طریقہ اس وقت پسندیدہ تھا مگر اب یہ تکرار گراں گزرتی ہے۔ اس ڈرامے میں متفرق اشعار کم ہیں۔ نثر کو پُرکشش بنانے کے لیے کہیں کہیں اس میں قافیے کا استعمال ہوا ہے۔ تشبیہ و استعارے کے استعمال سے بھی وہ اپنی نثر کو پُر اثر بناتے ہیں۔

پیش کش کے لحاظ سے بھی یہ ڈراما نہایت موزوں ہے۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے اسٹیج پر پیش کرنے میں دقّت ہو۔ اسٹیج کی ضروریات کو نظر میں رکھ کر ہی اسے لکھا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ اردو کا ایک شاہکار ڈراما ہے، جو طویل بھی ہے اور جسے مکمل طور پر اس کتاب میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسے مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں اصل قصے کے ساتھ ساتھ ایک مزاحیہ قصہ ''نصیبن'' اور ''کرامت'' کا بھی چلتا رہتا ہے، جس کا اصل قصے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا اسے نکال دیا گیا ہے۔ غیر ضروری اشعار اور گانے بھی خارج کر دیے گئے ہیں۔ کچھ مکالمے بھی نکال دیے گئے ہیں۔ مگر یہ اس سلیقے کے ساتھ کیا گیا ہے کہ کہانی میں تسلسل برقرار رہے اور اصل قصہ کہیں مجروح نہ ہو۔

اس ڈرامے کا قصہ اس طرح ہے کہ سلطنت روما میں رومن کے علاوہ یہودی قوم بھی آباد ہے۔ ایک نوجوان مارُکس کو عِزرا یہودی کی لڑکی حنّا سے محبت ہو جاتی ہے۔ حنّا بھی اس سے سچی محبت کرتی ہے مگر مختلف وجوہات کی بنا پر، اسے شبہہ ہو جاتا ہے کہ مارُکس یہودی نہیں ہے۔ وہ مارُکس سے زور دے کر حقیقت دریافت کرتی ہے تو وہ رومن ہونے کا اقرار کر لیتا ہے۔ مگر اس سے سچی محبت کا یقین بھی دلاتا ہے اور گھر سے کہیں دور چل کر شادی کر لینے کے لیے کہتا ہے۔ پہلے تو حنّا تیار نہیں ہوتی، مگر مارُکس خودکشی کر لینے کی دھمکی دیتا ہے تو حنّا کو اس کی محبت پر یقین آ جاتا ہے۔ دونوں گھر سے جانا ہی چاہتے ہیں کہ عِزرا سامنے آ جاتا ہے، جو چھپ کر ساری باتیں سن رہا تھا۔ دونوں اس سے معافی مانگتے ہیں اور رحم کی درخواست کرتے ہیں۔ عِزرا شادی کے لیے تیار ہو جاتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ مارُکس یہودی مذہب اختیار کر لے۔ مارُکس تیار نہیں ہوتا اور وہاں سے چلا جاتا ہے۔

ایک روز حنّا اور مارُکس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ وہ عام آدمی نہیں بلکہ اس ملک کا ولی عہد ہے۔ اگر وہ اپنا

مذہب تبدیل کر لیتا تو اسے سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ وہیں حنّا کو پتہ چلتا ہے کہ مارکُس کی شادی کل شہزادی آکٹیویا سے ہونے جا رہی ہے، جو پہلے سے طے تھی۔ اسے بے حد رنج ہوتا ہے اور وہ اسے روکنے کا تہیہ کر لیتی ہے۔

شادی کے موقعے پر عِزرا یہودی اپنی قوم کی طرف سے نذرانہ پیش کرنے کے لیے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ حنّا بھی وہاں پہنچ جاتی ہے اور بادشاہ کو ساری بات بتا کر انصاف کی طلب گار ہوتی ہے۔ بادشاہ شہزادہ مارکُس سے پوچھتا ہے تو وہ اپنے جرم کا اقرار کر لیتا ہے۔ بادشاہ اسے قید کر کے مذہبی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم دیتا ہے۔

اسی روز شہزادی، حنّا کے پاس جاتی ہے اور شہزادے کو معاف کر دینے کی درخواست کرتی ہے۔ حنّا کو مارکُس پر رحم آجاتا ہے اور اپنا الزام واپس لے لیتی ہے مذہبی پیشوا بروٹس جو یہودیوں سے نفرت کرتا ہے اور پہلے بھی ان پر کافی ظلم کر چکا ہے، شہزادے پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں حنّا اور عِزرا کو جلتے ہوئے تیل میں ڈال دیے جانے کا حکم دیتا ہے۔ مارکُس ان کے لیے رحم کی درخواست کرتا ہے، تو بروٹس، عِزرا کو مذہب تبدیل کرنے کی شرط پر معافی دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ عِزرا اسے نہیں مانتا ہے اور اسے سولہ سال پہلے کا واقعہ یاد دلاتا ہے، جب شاہ ''نیرو'' کے حکم سے شہر روما میں چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی۔ اس آگ میں بروٹس کی بیوی جل کر خاک ہوگئی تھی۔ مگر اس کی شیر خوار بیٹی کو آگ سے اسی نے بچالیا تھا۔ اور اب یہی اس کی بیٹی ہے، جسے اس نے اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے۔ بروٹس ثبوت مانگتا ہے۔ عِزرا یہودی حنّا کے گلے میں پڑا ہوا شاہی خاندان کا تعویذ اور مروارید کی مالا دکھاتا ہے۔ بروٹس اسے پہچان کر تصدیق کرتا ہے۔ اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے۔ دونوں سے معافی مانگتا ہے اور آئندہ کے لیے نیک زندگی گزارنے کا عہد کرتا ہے۔

اس وقت آکٹیویا حنّا سے کہتی ہے کہ تم بھی شاہی خاندان سے ہو، تو کیوں نہ میری ہر راحت اور خوشی میں برابر کی شریک ہو جاؤ۔ بادشاہ بھی اس کی اجازت دے دیتا ہے مگر حنّا یہی کہتی ہے کہ مجھے اس جھوٹی دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہیے۔ تم دونوں جیو اور خوش رہو۔ یہیں ڈراما ختم ہو جاتا ہے۔

5258CH02

یہودی کی لڑکی

کردار

مرد

1.	مارکُس	رومن شہزادہ
2.	بروٹس	مذہبی رہنما
3.	عِزرا	ایک بوڑھا یہودی
4.	بادشاہ	رومن بادشاہ
5.	سپاہی	رومن فوج کا سپاہی
6.	کیشیش	رومن سردار

خواتین

1.	حنّا	مارکُس کی معشوقہ
2.	آکٹیویا	رومن شہزادی اور مارکُس کی منگیتر
3.	جونا	آکٹیویا کی ملازمہ

© NCERT not to be republished

پہلا ایکٹ — پہلا سین

محل

مارکس : آکٹیویا، تم اور یہاں؟

آکٹیویا : ے

جو نظر اب ہے وہ پہلے تری بے دید نہ تھی
اس طرح آنکھ بدل لے گا یہ اُمید نہ تھی

آخر اس بے رُخی کا سبب؟

© NCERT not to be republished

مارکس : کوئی نہیں۔
آکٹیویا : اس ناراضگی کا باعث؟
مارکس : کچھ نہیں۔
آکٹیویا : تو پھر کیا ہوگیا؟
مارکس : سودا ہوگیا۔
آکٹیویا : ہوش وحواس کدھر گئے؟
مارکس : مرحوم آرزوؤں کے ساتھ وہ بھی مر گئے۔
آکٹیویا : تو کیا اب مجھے تم سے کوئی آس نہیں؟
مارکس : آس دلانے والی چیز ہی میرے پاس نہیں۔
آکٹیویا : میرے پیارے وہ کیا؟
مارکس : دل ۔

میں دل کو روؤں گا اور روئے گا دل عمر بھر مجھ کو
نہ میری ہے خبر دل کو نہ دل کی ہے خبر مجھ کو

پہلا ایکٹ ـــ دوسرا سین

یہودیوں کا محلّہ

(مارکس کا یہودیوں کے لباس میں آنا)

مارکس : پیاری حنّا۔ میری یہ خواہش ہے کہ تم چہرے پر نقاب ڈالے بغیر گھر سے باہر نہ نکلا کرو۔
حنّا : اس کی وجہ؟
مارکس : وجہ یہ ہے کہ جس طرح بارش سے دھلے ہوئے شفاف آسمان پر شفق کی سرخی شہاب پاشی کرتی ہوئی حدّ نظر تک پھیل

جاتی ہے تو تمام دنیا بے پایاں مستی میں ڈوبی ہوئی پُر شوق نگاہوں سے اس کی دلفریبیوں پر قربان ہونے لگتی ہے اسی طرح جب تمھارے گلابی گالوں کے عکس سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگانے اور ہنسنے لگتا ہے تو قدرت کی مخلوق ہی نہیں خود قدرت بھی تمھیں پیار سے دیکھنے لگتی ہے۔

ہے نظر کاتب کی اپنے ہاتھ کی تحریر پر
خود مُصوِّر بھی مٹا جاتا ہے اس تصویر پر

حنّا : تو میرے پیارے۔ تم رشک کرتے ہو؟

مارکس : رشک؟ میں اُس لباس پر رشک کرتا ہوں جو تمھارے خوبصورت جسم کو اپنی آغوش میں لیے رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں تمھارے سائے سے رشک کرتا ہوں جو ان قدموں سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

اسیر پنجہ عہد شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے
کسی کے دردِ محبت نے عمر بھر کے لیے
خدا سے مانگ لیا انتخاب کر کے مجھے

(دونوں کا گاتے ہوئے جانا۔ رومن سرداروں کا داخل ہونا)

not to be republished

سپاہی نمبر 1 : تو کیا آپ اس مشرقی ستارہ کو روم کی کلیوپیٹرا کا خطاب دیتے ہیں؟

کیشیش : ہاں۔ اور اس خطاب پر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے حسن خدا داد کی داد دینے میں بُخل سے کام لے رہا ہوں۔

سپاہی نمبر 2 : جب تو اُس کے حُسن کی غلامی کرنے کے لیے رومن سورماؤں میں سے بہت سے سینزر وانیٹونیو پیدا ہو جائیں گے۔

سردار : دیکھو دیکھو وہ کافر ادا یہودن اسی طرف آ رہی ہے۔

کیشیش : قسم ہے رومن خون کی۔ میں اس روم کی سب سے زیادہ حسین دوشیزہ کے حسن کی داد دیے بغیر کبھی یہاں سے نہ جاؤں گا۔

سپاہی نمبر 1 : اس کی مرضی کے خلاف؟

کیشیش : ہاں۔ہاں۔

سپاہی نمبر 3 : جبراً؟

کیشیش : بے شک۔ہم کون ہیں؟

سپاہی نمبر 2 : معزز رومن۔

کیشیش : اور یہودی کون ہیں؟

سپاہی نمبر 4 : رومنوں کے ادنیٰ غلام۔

کیشیش : تو بس پس و پیش بیکار ہے۔غلام اور غلام کے مال پر آقا کو ہر طرح کا اختیار ہے۔

(حنّا کا آنا)

حنّا : (پھول سے مخاطب ہو کر) ؎

فدا ہوں جس طرح اُس گل پہ تجھ پر بھی فدا ہوتی
جو تجھ میں اُس کی رنگت، اس کی بو، اس کی ادا ہوتی

کیشیش : ؎

فقط یہ پھول ہی کیا مستحق ہے مہربانی کا
اِدھر بھی اک اُچٹتی سی نظر، صدقہ جوانی کا

حنّا : جناب آپ کون ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؟

کیشیش : میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ پھول زیادہ نظر فریب ہے یا یہ؟ یہ زیادہ خوبصورت ہے یا یہ؟ اس کی پنکھڑیوں کو دیکھ کر طبیعت للچاتی ہے یا ان پنکھڑیوں کو؟

حنّا : صاحب آپ ہوش میں ہیں؟

کیشیش : ؎

رحم کرتی ہیں کہیں، یہ نرگس مے نوش بھی
اک نظر میں دل بھی چھینا ساتھ دل کے ہوش بھی

حنّا : بس بس۔ ایک غیرت دار شریف زادی اس سے زیادہ اپنی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔

کیشیش : ؎

مست مے نشاط بھی ہیں باغ باغ بھی
آنکھیں بھی شاد کام ہوئیں اور دماغ بھی
منت پذیر حسن خدا داد کیجیے
یہ ہونٹ رہ گئے ہیں انھیں شاد کیجیے

(حنّا کو پکڑ لینا)

حنّا : چھوڑ دے۔ چھوڑ دے بے رحم موذی مجھے چھوڑ دے۔

کیشیش : ؎

صرف کر دے زور، جتنا بھی پر و بازو میں ہے
چھٹ چکا وہ صید جو صیاد کے قابو میں ہے

حنّا : دوڑو۔ بچاؤ۔ یہ کمینہ میری عزت پر حملہ کرتا ہے۔

(مارگس کا یہودی کے لباس میں آنا)

مارگس : خبردار۔ او بدمعاش پاجی۔ اگر ایک انچ بھی آگے بڑھا تو یہ بالشت بھر کی چھری قبضے تک سینے میں اتار دوں گا۔

کیشیش : تو کون؟

مارکُس : تجھ پر لعنت بھیجنے والی زبان، تجھے سزا دینے والا ہاتھ۔

کیشیش : حقیر ہستی۔ کیا تو رومن قوم کے معزز نوجوان کا مقابلہ کرنے آیا ہے؟

مارکُس : معزز؟ ایسی کمینی حرکتیں اور معزز؟ جب تمھارا دِل، تمھارا خیال، تمھاری ہر چیز ذلیل ہے تو پھر تمھارے معزز ہونے کی کیا دلیل ہے؟

کیشیش : بس خاموش۔ شاید تیرے دل میں اپنی زندگی کا پیار نہیں ہے۔ کیا تو رومن قوم کے غرور، غصہ اور ہیبت ناک انتقام سے خبردار نہیں ہے؟

مارکُس : ذلیل غلام۔ تو اپنے پاجیانہ خیالات کے اظہار میں تمام رومن قوم کو کیوں شامل کرتا ہے؟

یہ طرز زیست ہے ان کی نہ یہ قرینہ ہے
وہ سب کمینے نہیں صرف تو کمینہ ہے

کیشیش : بس یہ اپنی بدزبانی سے اپنی موت کے فتوے پر مہر کر چکا۔ سپاہیوں باندھ لو اس باغی کو۔

مارکُس : بدبخت، نامراد۔ بھالے نیچے جھکا دو۔

کیشیش : کس کے حکم سے؟

مارکُس : میرے حکم سے۔

کیشیش : تو کون؟

مارکُس : دیکھ۔

(مارکُس کا سینہ کھول کر نشان شاہی دکھانا)

کیشیش : کون شہزادہ مارکُس؟ آپ؟

مارکُس : چُپ۔

(سپاہیوں کا بھالے جھکا دینا اور حنّا کا مارکُس سے لپٹ جانا)

پہلا ایکٹ — چھٹا سین

عِزرا کا مکان

(حنّا اور مارکُس آتے ہیں)

حنّا : میں حیران ہوں کہ اس روز ان انسان نما درندوں کے زور کس قوت نے گھٹا دیے۔ تم میں وہ کون سی چھپی ہوئی طاقت ہے جسے دیکھتے ہی ظالم رومنوں نے اپنے خونی برچھے اور مغرور سر، زمین کی طرف جھکا دیے۔

مارکُس : پیاری حنّا۔ جس طرح اکثر لوگ سانپ اور بچھو کا منتر جانتے ہیں، اسی طرح ان رومنوں پر قابو پانے کے لیے میرے پاس بھی ایک طلسم ہے۔

حنّا : مگر دیکھنا پیارے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو، کچھ ان کا اثر ہو جائے
اس وفا اور محبت کو نظر ہو جائے

مارکُس : پیاری حنّا۔ اگر کچھ سنانے ہی کو جی چاہتا ہے تو جی بھر کر سنا لو۔ مگر فال بد منھ سے نہ نکالو۔

(عِزرا کا اندر آنا)

عِزرا : ظالم، بے دین، یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ حنّا۔ حنّا۔

حنّا : حکم پیارے ابّا۔

عِزرا : رومنوں کے بادشاہ کی بھتیجی اور ولی عہد سلطنت کی منگیتر شہزادی آکٹیو یا اس طرف سے گذر رہی تھی۔ اتفاقاً ایک ستون سے ٹکرا کر اس کے رتھ کا پہیہ چور چور ہو گیا اور اس کا شاہی غرور اپنی غریب رعیت سے پناہ اور مدد مانگنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

مارکُس : تو کیا وہ آپ کے یہاں قیام کرنا چاہتی ہے؟

عِزرا : ہاں۔ دوسری سواری کے آنے یا پہلی کے درست ہو جانے تک وہ پاک قوم کی لڑکی ایک ناپاک یہودی کے گھر میں

ٹھہرنا چاہتی ہے۔

حنّا : تو ابا جان جایئے۔ مہمان بن کر آنا چاہتی ہے تو ضرور بلالایئے۔

مارکُس : (خود کلامی) آکٹیویا اور عزرا کے گھر میں۔ کیا اپنی منگیتر کی موجودگی میں میرا راز راز رہ سکے گا۔ (مخاطب ہو کر) ہاں۔ کیا میں ہٹ جاؤں؟

عِزرا : کیوں؟

مارکُس : شاید شہزادی ایک غیر شخص کی موجودگی پسند نہ کرے۔

عِزرا : ٹھہرو۔ مجھے اس ناخواندہ مہمان کے آنے کے بعد تمھاری مدد کی ضرورت ہوگی۔

(جانا)

مارکُس : (خود کلامی)؎

چغلیاں کھائے گا گھبرائے ہوئے چہرے کا رنگ
کھول دے گی بھید دونوں پر پریشانی مری

(آکٹیویا کا عِزرا کے ساتھ اندر آنا)

آکٹیویا : ہاں عِزرا۔ گاڑی کے اتفاقیہ ٹوٹ جانے سے مجھے قدرے تکلیف تو ہوئی تاہم اس تکلیف میں بھی اپنے لیے ایک طرح کی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ اگر یہ ناشدنی واقعہ پیش نہ آتا تو مجھے اپنے چچا کی ایک وفادار رعیت کے جوہر پہچاننے اور یہودی قوم کی اخلاقی خوبیوں کو جاننے کا کبھی موقع نہ ملتا۔

عِزرا : میں اس نوازش کا ممنون ہوں۔ اگر حضور کے ہم قوم، ہمارے آقا، ہماری جان و مال کے مالک معزز رومن بھی اپنی رعایا کے ساتھ یہی برتاؤ رکھیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی حکومت چاند اور سورج کی عمر پا سکتی ہے۔

آکٹیویا : (مارکُس کو دیکھ کر خود کلامی) تعجب، حیرت۔ کس قدر ملتی جلتی صورت۔ ایک قلم کی دو تصویریں۔ یہودی فریم میں رومن تصویر؟

مارکُس : (خود کلامی)؎

آج توقیر گئی، بات گئی، شان گئی
کچھ بنائے نہ بنے گی، جو وہ پہچان گئی

آکٹیویا : عِزرا۔ یہ نوجوان شخص کون ہے؟

عِزرا : حضور۔ یہ میرے ایک ہم مذہب کی آنکھ کا تارا ہے اور مجھے اولاد سے بھی زیادہ پیارا ہے۔

آکٹیویا : کیوں جونا۔کیا یہ چہرہ دیکھنے والے کے دل میں حیرت پیدا نہیں کرتا؟

جونا : جی ہاں۔اگر یہ آدمی یہودی کے لباس میں نہ ہوتا تو میں ضرور شہزادہ مارُکس سمجھ کر دوزانو ہوکر اس کے دامن کو بوسہ دیتی۔

عِزرا : حضور۔ میں تھوڑی دیر کی غیر حاضری کی معافی چاہتا ہوں۔

آکٹیویا : خوشی کے ساتھ۔

مارُکس : ضرورت ہو تو میں بھی ساتھ چلوں؟

عِزرا : ٹھہرو۔کیا انگاروں کے فرش پر کھڑے ہو؟

(عِزرا اور حنّا کا جانا)

مارُکس : (خودکلامی)۔

یہ کہاں سے آ گئی حیران کرنے کے لیے
اور دروازے نہ تھے کیا اس کو مرنے کے لیے

آکٹیویا : جونا۔ میں اس نوجوان یہودی سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔اس سے کہہ کہ میرے نزدیک آئے۔

جونا : ذرا قریب آنا بھائی۔

آکٹیویا : جونا۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کبھی حیرت زدہ نہیں ہوئی جتنی آج اس کی اور اپنے پیارے کی ملتی جلتی صورت دیکھ کر ہوئی ہوں۔

دل پوچھ رہا ہے آنکھوں سے، یہ بہتر یا وہ اعلیٰ ہے
قدرت نے ایک ہی سانچے میں کیا دو سکّوں کو ڈھالا ہے

(عِزرا اور حنّا کا دوبارہ آنا)

حنّا : (خودکلامی)۔

آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں ہونٹوں پہ اگرچہ تالا ہے
جس چاند کی میں دیوانی ہوں کیا یہ بھی اسی کا ہالا ہے

عِزرا : (خودکلامی)

اس کے بھی رنگ عجب سے ہیں اس کا بھی طور نرالا ہے
ہے یہ بھی چپ اور یہ بھی چپ کچھ دال میں کالا کالا ہے

(سپاہی کا آنا)

سپاہی : حضور عالیہ۔سواری تیار ہے۔صرف حضور کا انتظار ہے۔

آکٹیویا : اچھا عزرا۔ میں نے تمھیں بہت تکلیف دی۔ اگر پھر کبھی اس طرف سے گذری تو ضرور تم سے ملنے کی خوشی حاصل کروں گی۔

عِزرا : حضور کی رعیت نوازی سے مجھے ایسی ہی امید ہے۔

(آکٹیویا، جونا اور سپاہی کا جانا)

مارکُس : (خودکلامی)

میں تو سمجھا تھا، کہ پوری آج رسوائی ہوئی
خیر گذری، ٹل گئی، سر سے بلا آئی ہوئی

حنّا : یہ شہزادی تم سے واقف ہے؟

مارکُس : اتنا ہی جتنا وہ تم سے واقف ہے۔

حنّا : ہوں۔ اس روز رومن سرداروں کا یک بیک تمھارے آگے جھک جانا، آج شہزادی آکٹیویا کا تمھیں دیکھ کر حیرت میں آنا ظاہر کرتا ہے کہ تم پر اندھا بھروسا عقل کا قصور ہے۔ تمھارا رومنوں سے کوئی نہ کوئی پوشیدہ تعلق ضرور ہے۔

مارکُس : پیاری حنّا۔ اس بات کا جواب دینے کی نہ مجھ میں جرأت ہے اور نہ میں اس کی ابھی ضرورت سمجھتا ہوں۔

(دونوں کا جانا)

پہلا ایکٹ — آٹھواں سین

باغ

(مارکُس اور حنّا کا باتیں کرتے دکھائی دینا)

حنّا : بس بس۔ میں اب تشویش اور خوف کی حالت میں ایک نامعلوم مدت تک رہنا نہیں چاہتی۔

مارکُس : دماغ خیال کا اور خیال لفظوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ مجھے جواب دینے کے لیے کچھ مدت دو۔

حنّا : بس آج ہی یا کبھی نہیں۔ میرا دل اس کانٹے کی چبھن کو زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔

یہ رنج جائے یہ تکلیف و اضطراب مٹے
کہو کہو کہ کسی طرح یہ عذاب مٹے

مارکُس : تو پیاری حنّا۔ حقیقت کے چہرے سے نقاب دور ہوتی ہے دیکھو اصلیت کی بھیانک شکل دیکھ کر خوفزدہ نہ ہونا۔ نفرت نہ کرنا۔ میں آج تک یہودی کے لباس میں ایک دھوکے باز عاشق کا پارٹ کر رہا تھا۔ آہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اچھا سنو سچ یہ ہے کہ۔

ہر اک گمان الگ ہے ہر اک یقین الگ
تمھارا دین الگ ہے ہمارا دین الگ

حنّا : تو کیا تم ہمارے ہم مذہب نہیں ہو؟

مارکُس : نہیں ۔ میں تمھارے مذہب کے دشمنوں کی ڈالی ہوئی بنیاد ہوں۔ یعنی رومن خون اور رومن باپ کی اولاد ہوں۔

حنّا : تم یہودی نہیں ہو؟

مارکُس : نہیں۔

حنّا : تو پھر تمھیں یہودی بننے کو کس نے کہا؟

مارکُس : تمھاری محبت نے۔

حنّا : بس بے درد بس! ایک دغاباز رومن ایک معصوم یہودی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

مارکُس : تو کیا تم میری مجبوریوں کا خیال کرکے میرا گناہ نہیں معاف کرسکتیں؟

حنّا : نہیں۔

مارکُس : تو کیا اپنا دل مجھ سے پھیر لوگی؟

حنّا : آہ کاش یہ ممکن ہوتا۔ مگر نہیں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ یہی نہیں ہوسکتا۔

(عِزرا کا آنا اور چھُپ کر دونوں کی باتیں سننا)

مارکُس : تو پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے کیوں انکار ہے؟

حنّا : اس لیے کہ اس دل پر میرا قبضہ ہے مگر اس ہاتھ پر میرے باپ کا اختیار ہے۔

مارکس : اگر تمھیں انکار ہے تو پھر میرا اس دنیا میں جینا بیکار ہے۔

(اپنے آپ کو خنجر مارنے کی کوشش کرتا ہے)

حنّا : ٹھہرو۔ پیارے ٹھہرو۔

مارکس : بس ہاں یا نہیں۔ ایک لفظ

حنّا : تھوڑی دیر۔ غور کرنے کے لیے، تھوڑی دیر۔

مارکس : ایک منٹ نہیں۔

حنّا : آہ...

مارکس : بس کہو کہ مجھے منظور ہے۔

حنّا : لے چل خوبصورت جادوگر، لے چل۔ حنّا اس دل سے مجبور ہے۔

تیری ہوں، تیرے ساتھ ہوں، دیتی ہوں زباں میں
اب سایہ کے مانند جہاں تو ہے وہاں میں

(دونوں جانا چاہتے ہیں کہ عِزرا سامنے آجاتا ہے)

عِزرا : ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟ کہاں بھاگ کر چھپنا چاہتے ہو؟

حنّا : رحم۔ پیارے ابا ہم گہنگاروں پر رحم۔

عِزرا : رحم۔ ایسے نابکار پر؟ رحم تجھ جیسی ناہنجار پر؟ کیا اسی دن کے لیے میں نے تجھے پالا تھا؟ اور کیوں او رومن قوم کے نجس کتے۔ جس نے ہمیشہ محبت سے تیری پیٹھ کو تھپتھپایا۔ جس نے تجھے شریف اور وفادار سمجھ کر تیرے منھ پر ٹھوکر مارنے کے بدلے تجھے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھایا۔ اسی محسن کے کلیجے میں اپنے زہریلے دانت گڑونے کے لیے تیار ہوا۔

حنّا : ابا۔ پیارے ابا۔ بے شک ہم دونوں محبت کرنے کے مجرم ہیں مگر ہمارا جرم گناہ کی آلودگی سے پاک ہے۔ اس لیے ہم سے نفرت کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

مارُکس : ؎

ہے پاک گناہوں سے ہماری یہ خطا بھی
غارت ہوں، اگر ہم کو بدی نے ہو چھوا بھی
ہم چشمہ الفت میں ہیں مانند کنول کے
جو پانی کے اندر بھی ہے پانی سے جدا بھی

عزِرا : تو کیا تم محبت کرنے کے سوا اور ہر طرح بے قصور ہو۔ چاند کی طرح اس زمین کی برائیوں سے دور ہو؟

مارُکس : ہاں بزرگ عزرا۔ ایسا ہی ہے۔

عزِرا : افسوس۔ میں نے کیا سوچ رکھا تھا اور یہاں کیا واقعہ رو بہ کار ہے۔ سچ ہے جس طرح دریا کی رو کے سامنے ایک تنکا بے بس ہے۔ اسی طرح تقدیر کے آگے تدبیر ناچار ہے۔

حنّا : ابا۔ پیارے ابا۔

عزرا : تو کیا تم اسے عزیز رکھو گے؟

مارُکس : اپنی جان کی طرح۔

عزِرا : اچھا تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور خوشی سے اس کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دیتا ہوں آگے بڑھو۔ دو زانو ہو— نہیں سنا۔ دو زانو ہو۔

مارُکس : کیا آپ مجھ سے کوئی مزید اقرار کرانا چاہتے ہیں؟

عزِرا : ہاں۔ بغیر مذہب بدلے۔ ایک رومن، یہودی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس لیے سب سے پیش تر تمھیں اسرائیلی عقائد کی تعلیم دے کر اپنے مذہب میں لاؤں گا اور پھر موسوی شریعت کے مطابق تم دونوں کا ہاتھ ملا کر باپ کے فرض سے ادا ہو جاؤں گا۔

مارُکس : ؎

کس کو چاہوں، کس کو چھوڑوں، کشمکش میں جان ہے
اک طرف یہ حور ہے اور اک طرف ایمان ہے

عزِرا : جواب دو۔ کیا خیال ہے؟

مارکس : میں حنّا کو چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنا مذہب چھوڑنا محال ہے۔

عِزرا : تو پھر نہیں؟

مارکس : نہیں۔

عِزرا : تب کیا۔ رومن قوم کے ذلیل کتے۔ کیا تو معصومیت کے معبد میں گناہوں کی بدبو پھیلانے، فسق و فجور کا جال بچھا کر ایک بھولی بھالی لڑکی کو حرام کاری کا راستہ بتانے آیا تھا۔

حنّا : پیارے۔ میرے پیارے۔ یہ کیا؟ ؎

ہم وہی اور تم وہی پھر یک بیک کیا ہو گیا
با وفا دل آج کیوں بے درد ایسا ہو گیا

مارکس : حنّا۔ میری قوت فیصلہ بیکار ہوگئی۔ میرے چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ اب مجھے جانے دو۔

(پردہ)

دوسرا ایکٹ — پہلا سین

شاہی محل

(مارکس اور آکٹیویا کا آنا)

مارکس : پیاری آکٹیویا۔ احمق، شرابی اور پاگل، ان میں سے کوئی جرم کرے تو درگذر کی جا سکتی ہے مگر جس گناہ میں عقل تمیز اور ارادہ شامل ہو اس سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی۔ میں کس منہ سے معذرت پیش کروں؟

آکٹیویا : میرے دل کے مالک۔ انسان اور غلطی ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ جو گناہ نہیں کرتا وہ بے شک سزاوار توصیف ہے۔ مگر جو گناہ کر کے نادم ہوتا ہے اور تلافی کرتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف ہے۔

مارکس : تب تم میری گذشتہ بے اعتنائیوں کو معاف کرتی ہو؟

آکٹیویا : میرے پیارے بار بار معافی کا لفظ دُہرا کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو؟

(آکٹیویا کا جانا)

مارُکس : (خود کلامی) دغا باز مارُکس ۔ بے وفا رومن ۔ تو کتنا ذلیل شخص ہے؟ کہ زبان سے آکٹیویا کے ساتھ محبت کا اظہار کر رہا ہے ۔مگر تیرا دل ابھی تک حنّا کو پیار کر رہا ہے ۔ کیا ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرے گا؟ کیا ایک شریف یہودن کی زندگی اور اس رومن شہزادی کا بھی حال و مستقبل تباہ کرے گا؟

(جانا چاہتا ہے کہ حنّا آتی ہے)

حنّا : ٹھہرو۔ ؎

جاتے کہاں ہو مجھ کو ٹھکانے لگا کے جاؤ
مارا ہے جس کو اس کا جنازہ اٹھا کے جاؤ

مارُکس : حنّا ۔تم اور یہاں؟

حنّا : ہاں ۔

مارُکس : کیوں آئیں ۔کس کے پاس آئیں؟

حنّا : اپنے صیاد کے پاس۔ قتل کر کے بھول جانے والے جلاد کے پاس۔

مارکس : حنّا۔ تم آج سے پہلے مجھے کیا سمجھتی تھیں؟

حنّا : ایک نیک یہودی۔

مارکس : اور اب کیا سمجھتی ہو؟

حنّا : ایک بے وفا رومن۔

مارکس : لیکن میں نہ وہ تھا نہ یہ ہوں۔

حنّا : تو پھر۔

مارکس : میں سلطنت روم کا ولی عہد یعنی اس ملک کا ہونے والا شہریار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے سے لاچار ہوں۔

حنّا : تم ولی عہد ہو؟ اس ملک کے ہونے والے بادشاہ ہو؟

مارکس : ہاں۔ اب تم ہی منصف ہو۔ اگر میں تمھارے باپ کی شرط منظور کر لیتا تو مجھے مذہب کے ساتھ سلطنت کی امید بھی چھوڑ دینی پڑتی۔

حنّا : تو کیا سلطنت سچی محبت سے زیادہ قیمتی ہے۔ شاہی تخت عورت کے پاک دل سے زیادہ مقدس ہے۔ غلاموں اور درباریوں کا شور تنہائی میں گونجتی ہوئی پیار کی راگنی سے زیادہ میٹھا ہے۔ شہزادے صاحب۔ اگر مرد کو دنیا میں عورت کی سچی محبت مل جائے تو اسے سلطنت کیا بہشت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

مارکس : جو ہو چکا اُس کا باعث مجبوری ہو یا بھول لیکن اب میں دوبارہ وہ خواب نہیں دیکھ سکتا۔

حنّا : کیوں؟

مارکس : کیونکہ کل شہزادی آکٹیویا سے میری شادی ہونے والی ہے۔

حنّا : شادی؟

مارکس : ہاں۔

حنّا : کان مجھے دھوکا تو نہیں دیتے، اپنے لفظوں کو پھر دہراؤ۔ شہزادی آکٹیویا سے تمھاری شادی ہوگی؟

مارکس : ہاں۔ ہاں۔

حنّا : ظالم بے درد۔ تو کیا اسے بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر مجھ ناشاد و نامراد کی طرح اُس غریب کی جوانی اور زندگی

کو بھی خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ اُس منحوس دن کا سورج کبھی طلوع نہ ہوگا میں تیرے بھولے شکار کو ہوشیار کر دوں گی کہ تو فریبی ہے، جھوٹا ہے، دغاباز ہے۔ یہ شادی ایک عورت کی زندگی کا انجام اور دوسری عورت کی تباہی کا آغاز ہے۔

مارکس : مگر یہ شادی کل کے دن مقرر ہو چکی ہے اور کل کا دن مقدر کے فیصلے کی طرح اٹل ہے۔

حنّا : تو مقدر کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ شادی ہرگز نہ ہوگی۔

مارکس : یہ ناممکن ہے۔

حنّا : اگر یہ ناممکن ہے تو میں یہ سمجھوں گی کہ ظالموں اور موذیوں کے لیے میدان صاف ہے۔ روم میں نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ قانون ہے، نہ انصاف ہے۔

باطن میں بزدلے ہیں بظاہر دلیر ہیں
یہ دور سے ڈرانے کو مٹی کے شیر ہیں

مارکس : ہُشت۔

(جانا)

دوسرا ایکٹ — دوسرا سین

دربار

(سہیلیوں کا ناچتے گاتے دکھائی دینا)

چوبدار : دولت و اقبال پائندہ، رعایائے روم کے رواج قدیم کے مطابق اس شہر کا مشہور سوداگر عِزرا یہودی اپنی قوم کی طرف سے عقیدت مندانہ نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے اور عالی مرتبت شہزادی سے شرفِ حضوری کی اجازت چاہتا ہے۔

آکٹیویا : کون آیا ہے؟ عِزرا۔ وہ یہودیوں میں سب سے زیادہ شریف ومعزز بوڑھا۔ میں اسے دیکھ کر ضرور خوش ہوں گی۔ حاضر کرو۔

بروٹس : (خود کلامی) دیوتا خیر کریں۔ یہ نحوست کی نشانی، مصیبت کا پیش خیمہ اس ہنسی خوشی کے جلسے میں کہاں سے نازل ہوا؟ (مخاطب ہو کر) شہزادی رواج کی سرپرستی جلسے سے باہر بھی ہوسکتی ہے۔ حکم دیجیے کہ نذرانہ لے کر اس نامبارک عبرانی کو دروازے ہی سے واپس کر دیا جائے۔

آکٹیویا : بزرگ باپ۔ ایک بے ضرر یہودی سے اتنی نفرت؟ کیا وہ کوئی چور یا خونی ہے؟

بروٹس : وہ ایک کافر نعمت۔ سنگ دل۔ زر پرست۔ دیوتاؤں کی راندہ اور دنیا کی مردود کی ہوئی قوم کا ایک شخص ہے۔ اس لیے اس مبارک جلسے میں اس کا شریک ہونا سخت بدشگونی ہے۔

آکٹیویا : مگر اُس کی موجودگی سے ہمارا کیا نقصان ہوسکتا ہے؟

بروٹس : راتوں کو ایک کونے میں بیٹھ کر رونے والا کتا کیا نقصان پہنچاتا ہے جو فوراً محلّہ سے مار کر بھگا دیا جاتا ہے۔ مکان کی چھت پر بیٹھ کر غم زدہ آواز میں بولنے والا اُلّو کیا تکلیف دیتا ہے جو فوراً بانس اور ڈھیلوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ جس طرح یہ دونوں اپنی موجودگی سے نحوست پھیلاتے ہیں اسی طرح یہ نجس یہودی بھی جہاں جاتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔

(عِزرا کا داخلہ)

آکٹیویا : عِزرا۔ خوش آمدید۔ تمھیں اس خوشی کے جلسے میں دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔

عِزرا : معزز شہزادی۔ سلطنت آپ کے گھر میں موجود ہے۔ زریں لباس آپ کے توشہ خانے میں بھرے پڑے ہیں۔ زر و جواہر آپ کی ٹھوکروں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس کی آپ کو پرواہ وضرورت ہو۔ اس لیے میں اپنی اور اپنے قوم کی طرف سے ان کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاؤں کا لازوال تحفہ پیش کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمائیے۔

آکٹیویا : میں اس تحفے کو تمام دنیا کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہوں۔

© NCERT not to be republished

عِزرا : اس فراخ مشربی و بے تعصبی کے صلے میں اُس آسمانی خدا کی بہترین برکتیں آپ پر سایہ گستر ہوں— اور اُس ملعون رومن پر جس نے میری بھولی بچی کی راحت و زندگی تباہ کر دی، بدترین عذاب نازل ہو۔

بروٹس : عزیز شہزادی۔ اگر اس نجس یہودی کی موجودگی ضروری ہے تو پہلے اسے مندر میں بھیج کر پاک بنایا جائے۔ اس کے بعد شادی کے جلسے میں بلایا جائے اور شرکائے جلسہ کی روحیں اس کی پرچھائیں پڑنے سے گندی نہ ہو جائیں، اس لیے احتیاطاً دور بٹھایا جائے۔

سردار1 : ناعاقبت اندیش یہودی خاموش رہ۔ کیا زندگی سے ناامید ہے؟ (بروٹس سے مخاطب ہوکر) بزرگ باپ۔ ایک فرسودہ حواس بوڑھے کو اپنا مخاطب بنانا آپ کے رتبہ اور شان سے بعید ہے۔

بادشاہ : میں بھی اس رائے کو پسند کر کے آپ کو اس کی احمقانہ جرأت سے چشم پوشی کرنے اور اس یہودی کو خاموش رہنے کا حکم دیتا ہوں........اٹھیے اور میرے عزیز بچوں کو شادی کی برکت دیجیے۔

(بروٹس کا اٹھ کر مارکُس اور آکٹیویا کا ہاتھ ملانا)

بروٹس : ؎

خوش اور ایک دوسرے پر مہرباں رہو
دنیا میں بامراد رہو شادماں رہو

(حنّا کا آنا)

حنّا : ٹھہرو۔ جب تک انصاف کی عدالت میں بادشاہ عادل کے روبرو ایک باوفا کی عرضی پیش ہوکر دغابازی کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہولے۔ اُس وقت تک ٹھہرو۔

بادشاہ : یہ کون؟

بروٹس : تو کون؟

مارکُس : (خودکلامی) ؎

باعثِ تکلیف راحت میں گراں جانی ہوئی
سن رہا ہوں صاف اک آواز پہچانی ہوئی

عِزرا : حنّا۔ تو یہاں کیوں آئی؟

حنّا : انصاف کے لیے۔

عزرا : کیا تجھے یقین ہے کہ ایک رومن شہزادے کے برخلاف ایک یہودی لڑکی کی فریاد سنی جائے گی؟

حنّا : اگر اس دربار کا دعویٰ ہے کہ یہاں امیر وغریب دونوں کا یکساں انصاف ہوتا ہے تو اس دعوے کی شرم رکھنے کے لیے اسے میری فریاد سننی پڑے گی۔

بادشاہ : اجنبی لڑکی۔ صاف لفظوں میں حال بیان کر۔ اگر تو مظلوم ہے تو تیرا حریف چاہے شاہی نسل ہی کا آدمی کیوں نہ ہو مگر انصاف ضرور تیری طرفداری کرے گا۔ بول۔ کس کی ستائی ہے؟ اور کس کے خلاف فریاد لائی ہے؟

حنّا : مجھے ستانے والا، دین و دنیا سے مٹانے والا۔ ؎

جفا پیشہ، وفا دشمن، ستم گر کون ہے؟ یہ ہے
شکایت جس کی کرتا ہے مقدر کون ہے؟ یہ ہے

آکٹیویا : کون؟ شہزادہ مارکس؟

بادشاہ : ولی عہدِ سلطنت؟

حنّا : یہی، یہی۔

بادشاہ : مارکس۔ سنتا ہے؟ اس الزام کا تیرے پاس کیا جواب ہے؟

مارکس : ؎

ستائی گئی ہے، بُرا کہہ رہی ہے
یہ جو کہہ رہی ہے بجا کہہ رہی ہے

آکٹیویا : دیوانی عورت۔ الزام لگانے سے پہلے انجام سوچ لے۔

حنّا : بچیے۔ بچیے۔ شہزادی صاحبہ۔ اس خوبصورت سانپ کے زہر سے بچیے۔

آکٹیویا : بس بس خاموش۔ میں اپنے پیارے کی نسبت ایسا کوئی لفظ سننا نہیں چاہتی جس سے اس کی توہین ہو۔

حنّا : شہزادی۔ ؎

سراسر مکر، سرتاپا دغا، نا آشنا ہے یہ
مری آنکھوں سے دیکھو تم تو ہو معلوم کیا ہے یہ
کنواری رہنا بہتر جانیے اس عقد ہونے سے
وفا کی ہے عبث اُمّید مٹی کے کھلونے سے

بروٹس : عالم پناہ اگر میری نصیحت قبول فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ عورت کے بیان پر کبھی یقین نہ کرنا چاہیے۔

عِزرا : سریرآرائے عدالت، سلطنت کا ایک معزز رکن ہو کر انصاف کے راستے میں روڑا اٹکانا، دباؤ ڈال کر شاہی انصاف اور شاہی رائے کو ایک مظلوم فریادی کے خلاف بنانا کیا ان جیسے مقدس اور مذہبی پیشوا کو سزاوار ہے۔ کیا سلطانِ عادل کا انصاف مظلوموں کا سرپرست ہونے کے بدلے ظالموں کا طرفدار ہے؟

بادشاہ : نہیں عبرانی کبھی نہیں۔ جس طرح آفتاب کی روشنی، امیر کے محل اور غریب کے جھونپڑے میں کوئی فرق نہیں کرتی اسی طرح میں بھی انصاف کے وقت ادنیٰ اور اعلیٰ سب کو یکساں جانتا ہوں۔ اپنی ذمہ داری اور اپنا فرض اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

عِزرا : بس تو پھر جھگڑا صاف ہے۔ آج کے روز آپ کے لیے صرف ایک ہی کام ہے اور وہ ان دونوں کا انصاف ہے۔

بادشاہ : میں انصاف کو استعمال کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر دوں گا۔

حنّا : خدا آپ کو مظلوموں کی حفاظت کے لیے قیامت تک زندہ رکھے۔ فرمائیے۔ آپ کی رعایا میں سے اگر کوئی شخص شادی کا وعدہ کر کے کسی عورت کو اپنی محبت میں گرفتار کرے اور اسے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کو اپنی دغابازی کا شکار کرے تو حضورِ والا کا قانون اس کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے؟

بادشاہ : موت۔ بغیر رحم کے موت۔

عِزرا : بس تو ہو چکا۔ فیصلہ ہو چکا۔ آپ شاہی نام کی عزت ہیں۔ تختِ سلطنت کے اہل ہیں۔ قلم اٹھایئے اور ولی عہد کے سزائے موت کے کاغذ پر دستخط فرمایئے۔

بادشاہ : مگر مجھے پہلے اس کا گناہ تو معلوم ہونا چاہیے؟

حنّا : یہ آپ کی عزت اور شہرت کو برباد کرنے والا، اس ملک کی غریب لڑکیوں کے سر پر تباہی لا رہا ہے۔ اس نے شادی کا وعدہ کر کے پہلے مجھے دھوکا دیا اور اب شہزادی آکٹیویا کو اپنی پُرفریب محبت کے پھندے میں پھنسا رہا ہے۔

بادشاہ : مارکُس۔ سنتا ہے؟ اٹھ کھڑا ہو۔ اس کا جواب دے۔ ورنہ بدترین قسم کی سزائے موت تیرے لیے تیار ہے۔

مارکُس : بے شک غلام اس کا خطاوار ہے اور عاجزی کے ساتھ حضور والا سے رحم کا امیدوار ہے۔

بادشاہ : رحم یہ کر سکتی ہے میں نہیں کر سکتا۔

بروٹس : خاقانِ عالم۔

بادشاہ : بس۔

بروٹس : عالی جاہ۔

بادشاہ : کچھ نہیں۔

بروٹس : یہ نہ ہونا چاہیے۔

بادشاہ : یہ ضرور ہوگا۔

بروٹس : میری یہ عرض ہے کہ قانون گمراہوں کے واسطے ہے نہ کہ بادشاہوں کے واسطے۔

بادشاہ : مگر انصاف کی تلوار آقا اور غلام دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔

بروٹس : عشق کا جوش ایک طرح کا جنون ہوتا ہے۔

حنّا : تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیروں کے سر تو تاج زر کے لیے ہیں اور غریبوں کے سر امیروں کی ٹھوکروں کے لیے ہیں۔

بروٹس : بے شک۔

عِزرا : واہ رے مذہب اور واہ رے مذہبی پیشوا۔

تمھارا غم ہے غم، مفلس کا غم بس اک کہانی ہے
تمھارا عیش ہے عیش اور ہمارا عیش فانی ہے
یہاں بچپن بڑھاپا واں بڑھاپا بھی جوانی ہے
تمھارا خون ہے خون اور ہمارا خون پانی ہے
یہ نخوت اور یہ زر کیا لے کے اپنے ساتھ جائے گا
یہیں رہ جائے گا سب یاں سے خالی ہاتھ جائے گا

حنّا : عادل سلطان۔ اب مجھے انصاف ملنے میں کیا دیر ہے؟ اگر آپ نے ابھی تک نہ سنا ہو تو میں اس سے بھی زیادہ بلند آواز سے انصاف پکار سکتی ہوں۔

بادشاہ : اُف کیا کروں اور کیا نہ کروں؟

عِزرا : عادل بادشاہ۔ کیا بیٹے کی محبت اور انصاف میں جنگ ہو رہی ہے؟

بادشاہ : ہاں۔ مگر فتح انصاف ہی کو ملے گی۔

حنّا : تو پھر انصاف ملنا چاہیے۔

بادشاہ : ضرور ملے گا۔

حنّا : آپ سے؟

بادشاہ : ہاں مجھ سے۔

حنّا : کہاں؟

بادشاہ : یہاں۔

حنّا : کب؟

بادشاہ : اسی وقت۔ بڑھوا ے شاہی حکم کے پرستارو۔ اس ناخلف کو حراست میں لے لو اور کل مذہبی عدالت میں انصاف کے لیے پیش کرو۔

بروٹس : حضور والا۔

بادشاہ : خبردار۔ جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔

(موسیقی)

دوسرا ایکٹ —— چوتھا سین

محل

(آکٹیویا کا آنا)

آکٹیویا : میری پیاری بہن، اتنی سخت نہ بن۔ نرمی اور رحم جو عورت کی بہترین صفتیں ہیں، ان کو غصے پر قربان نہ کر۔ بُرے کے ساتھ تو بھی بُری نہ بن۔

حنّا : نہیں ہرگز نہیں۔ اب اس کے لیے ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔

آکٹیویا : دیکھو میں بھی تمھاری طرح ایک عورت ہوں اور معزز قوم کی عورت ہوں۔ ساتھ ہی ایک بادشاہ کی بیٹی اور دوسرے بادشاہ کی بھتیجی ہوں مگر اس پر بھی اس کی زندگی بھیک میں پانے کے لیے ایک فقیرنی کی طرح تمھارے سامنے دامن پھیلاتی ہوں۔

حنّا : بچاؤں گی۔ بچاؤں گی۔ جب تم اور یہ دل دونوں اس کی طرفداری کرتے ہیں، تو ضرور بچاؤں گی۔ ؎

جاؤ اور کہہ دو وفا کی شرط پوری کر گئی

تم رہو جیتے کہ تم پر مرنے والی مر گئی

دوسرا ایکٹ — پانچواں سین

مذہبی عدالت

(مارکُس اور حنّا کا الگ الگ کٹھ گھروں میں کھڑے دکھائی دینا ایک طرف عزرا اور دوسری طرف آکٹیویا کا بیٹھے ہوئے نظر آنا۔ بروٹس کا اجلاس کی کرسی پر بیٹھنا۔ چند سپاہیوں کا حنّا اور مارکُس کو اپنی حراست میں لینا)

بروٹس : حنّا تو ہوش میں ہے؟

حنّا : ہاں۔

بروٹس : تجھ پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا گیا؟

حنّا : نہیں۔

بروٹس : تو بنا جبر و اکراہ اپنا پہلا بیان واپس لیتی ہے؟

حنّا : بیشک

عِزرا : حنّا۔ حنّا۔ کیوں محبت میں اندھی بن رہی ہے؟

حنّا : اس لیے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

عِزرا : کیوں اپنے ہاتھوں سے قبر تیار کر رہی ہے؟

حنّا : اس لیے کہ قبر میں جاؤں گی تو ایک بے وفا کے ظلم سے نجات پاؤں گی۔

عِزرا : عدالت اس کی باتوں کا یقین نہ کرے۔ یقیناً اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

بروٹس : حنّا۔ میں روم کے قانون کے مطابق تجھ سے تیسری مرتبہ دریافت کرتا ہوں کہ تو شہزادہ مارُکس پر لگائے ہوئے تمام الزامات واپس لیتی ہے؟

حنّا : ہاں۔ لفظ بہ لفظ

عِزرا : آہ

بروٹس : یہودی۔ چونکہ تم بھی اس دعوے میں تائید کرنے والے تھے اس لیے اب تم کیا کہتے ہو؟

عِزرا : جس قدر افریقہ کے بیابان میں ریت کے ذرے ہیں ان سے بھی زیادہ میرے پاس بولنے کے لیے الفاظ تھے لیکن اس ناعاقبت اندیش چھوکری کی وجہ سے میں اب کچھ کہنا نہیں چاہتا اور قسمت کے فیصلے کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔

بروٹس : تو اب میرا صرف اتنا فرض رہ گیا ہے کہ اپنا آخری حکم سنادوں....شہزادہ مارُکس آپ کو عزت و آبرو کے ساتھ رہا کیا جاتا ہے... اور حنّا اور عِزرا، تمھیں ایک رومن شہزادے پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں زندہ آگ میں جلائے جانے کی سزا دی جاتی ہے۔

حنّا : سزا۔ کس کو؟ مجھ کو یا میرے باپ کو؟

© NCERT not to be republished

بروٹس : دونوں کو۔

حنّا : مگر یہ انصاف کے خلاف ہے۔

بروٹس : میرا یہ فیصلہ مطابق انصاف ہے۔

حنّا : ارے نہیں نہیں۔

بروٹس : قانون اپنے فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں دیکھتا... جاؤ اور اپنی قسمت کے موجودہ فیصلے کو صبر کے ساتھ برداشت کرو۔

مارکُس : بزرگ باپ اپنے شہزادے اور اس ملک کے ہونے والے بادشاہ پر ایک عنایت۔

بروٹس : کیا؟

مارکُس : تھوڑی شفقت۔

بروٹس : یعنی؟

مارکُس : اپنی طاقت اور اثر کو کام میں لائیے۔ جس طرح ممکن ہو ان دونوں کی جان بچائیے۔

بروٹس : مگر عدالت؟

مارکُس : وہ آپ کے قبضے میں ہے۔

بروٹس : قانون؟

مارکُس : وہ آپ کا حکم ہے۔

بروٹس : موجودہ فیصلہ؟

مارکُس : وہ آپ کی رائے ہے۔

بروٹس : بادشاہ کی مرضی؟

مارکُس : وہ آپ کی مٹھی میں ہے۔

بروٹس : اپنے فیصلے کی آخری سطریں لکھتے وقت جب میں نے اس یہودی دوشیزہ کے بھولے چہرے کی طرف دیکھا تھا تو ایک نامعلوم جذبے کے اثر سے میری انگلیاں تھرتھرانے لگی تھیں اور اب بھی جب کہ یہ موت کی طرف جا رہی ہے۔

اپنی روح میں ایک عجیب ولولہ اور اضطراب محسوس کر رہا ہوں... اچھا آپ جائیے۔ مجھ سے جو ممکن ہوگا وہ کروں گا۔

مارکُس : تو میں ان دونوں کی زندگی آپ کو بطورِ امانت کے سپرد کرتا ہوں۔

بروٹس : میں کوشش کروں گا کہ دیانت دار امین ثابت ہوں (مارکُس جاتا ہے) حنّا تم اپنے باپ کو پیار کرتی ہو؟

حنّا : اپنے مذہب کی طرح۔

بروٹس : اولاد کے لیے ماں باپ اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں؟

عزرا : یقیناً

بروٹس : تو اولاد کی سلامتی کے لیے تمھیں روایت پرستی کے عقائد کو نثار کرنا ہوگا۔ جان بچانا چاہتے ہو تو اپنے بزرگوں کا مذہب چھوڑ کر تم دونوں کو رومن دین اختیار کرنا ہوگا۔

عزرا : فکر، دکھ، بیماری اور بڑھاپے کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی زندگی کی قیمت، مذہب سے ادا کروں؟ اس چند روزہ دنیا کے لیے ابراہیم اور موسیٰ کے خدا سے دغا کروں؟

بروٹس : میں نے تیری قوم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ اسی کی مستحق تھی مگر اب میری رحم دلی دیکھ کہ تجھے سراسر مجرم پاتا ہوں اور پھر بھی تیری جان بچاتا ہوں۔

عزرا : جان۔ جان کی اب مجھے کوئی پروا نہیں۔ البتہ اتنی آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے، ایک قاتل، پرفن، بے رحم رومن کا سب کس بل نکال دوں۔ اس کے پتھر جیسے کلیجے میں چٹکیاں لے لے کر سوراخ ڈال دوں۔

بروٹس : میں تجھے سخت بیوقوف پاتا ہوں۔

عزرا : میں تجھے آج سے سولہ برس پہلے کا واقعہ یاد دلاتا ہوں۔ جس وقت شاہ نیرو کے حکم سے شہر روما میں چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی، اُس وقت تیرے گھر میں ایک خوبصورت بیوی اور اس کی گود میں ایک چھ ماہ کی بچی تھی۔

بروٹس : اس بات کی یاد دلانے سے تیری مراد کیا ہے؟

عزرا : میں پوچھتا ہوں کہ ان دونوں کے آگ میں جل جانے کا واقعہ تو تجھے یاد ہے؟

بروٹس : ہاں۔ میں اُس منحوس دن کو، جس روز موت نے میری بیوی اور بچی کو مجھ سے چھین لیا، کبھی نہیں بھول سکتا۔

عزرا : نیرو کی آگ تیری بیوی کے لیے آتشیں کفن ثابت ہوئی مگر اس کے سینے سے لپٹی ہوئی تمھاری چھ ماہ کی معصوم بچی،

جو مردہ لاش پر قدرت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا افسوس کا آنسو معلوم پڑتی تھی.....

بروٹس : کیا وہ زندہ رہی؟

عِزرا : ہاں۔

بروٹس : اور ابھی تک زندہ ہے؟

عِزرا : ہاں

بروٹس : اسے کس نے بچایا؟

عِزرا : خدا کی ذات نے

بروٹس : کس نے آگ سے نکالا؟

عِزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : اس کا ٹھکانہ؟

عِزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروٹس : اُس سے ملنے کا طریقہ؟

عِزرا : نہیں بتا سکتا

بروٹس : نہیں عِزرا تجھے بتانا ہوگا۔

عِزرا : ہرگز نہیں۔ یہ میرا راز ہے، جو میری جان کا دم ساز ہے۔

بروٹس : عِزرا۔عِزرا۔مجھ پر رحم کر۔

عِزرا : رحم۔ رحم۔ آج یہ پہلا روز ہے کہ رحم کا لفظ تمھاری زبان سے نکلا اب تو تمھیں معلوم ہوگا کہ رحم کی ضرورت مظلوم یہودیوں ہی کو نہیں بلکہ ظالم رومنوں کو بھی ہوا کرتی ہے۔ ایک کنگال مفلِس یہودی کے پاس رحم کہاں سے آیا؟ جاؤ اپنے بے درد قانون سے مانگو۔ اپنی ظالم قوم سے طلب کرو۔ اپنے نامنصف دیوتاؤں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔ بھیک مانگو۔گڑگڑاؤ۔

بروٹس : بتادے عِزرا۔ بتادے میں اپنے قصوروں کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور سر جو مذہبی پیشوا کا تاج پہننے کے بعد اس

ملک کے بادشاہ کے سامنے بھی نہیں جھکا، آج تیرے قدموں پر جھکا تا ہوں۔

عزرا : کیوں؟ کیسا جھٹکا لگا؟

بروٹس : تو انکار؟

عزرا : لاکھ بار۔

بروٹس : نہیں جواب دے گا؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : نہیں بتائے گا؟

عزرا : نہیں۔

بروٹس : نہیں رحم کرے گا؟

عزرا : نہیں۔نہیں۔نہیں۔

بروٹس : اچھا نہیں تو نہیں سہی۔ اب میں زبردستی تیرے سینے سے یہ راز اگلواؤں گا۔ تیری ایک ایک بوٹی کا قیمہ کر کے اپنے کتوں کو کھلواؤں گا۔ جاؤ لے جاؤ ۔

رکھے اسے بھی وہیں، جس جگہ یہ آپ رہے
اب اس زمین پہ بیٹی رہے نہ باپ رہے

حنّا : اے رومن سردار۔

بروٹس : مردار۔

عزرا : خبردار۔

(پردہ)

© NCERT not to be republished

تیسرا ایکٹ — پہلا سین

راستہ

(حنّا سپاہیوں کے ساتھ قید خانے کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے)

© NCERT not to be republished

تیسرا ایکٹ ــــ دوسرا سین

دار العذاب

بروٹس : عِزرا! تو دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی ہم رومنوں سے مذہب، نیکی اور فراخ دلی میں افضل ہیں؟

عِزرا : بے شک

بروٹس : تو اس کا ثبوت دے۔

عِزرا : کس طرح؟

بروٹس : ثابت کر کہ تو درگذر اور نیکیوں کا دلدادہ ہے۔ ثابت کر کہ تیری روح میں انتقام سے رحم کا مادہ زیادہ ہے۔

عِزرا : مگر میں رحم کس پر کروں؟

بروٹس : مجھ پر۔

عِزرا : سب ہوگا۔ یہی نہیں ہوگا۔

بروٹس : عِزرا جو مفلس ہے وہ دولت چاہتا ہے۔ جس کے پاس دولت ہے وہ خطاب چاہتا ہے۔ جس کے پاس خطاب ہے وہ حکومت چاہتا ہے۔ میں تمھیں یہ تمام چیزیں بیک وقت دینے کو تیار ہوں۔ یہ سب لے لے اور اپنے دل کا راز مجھے دے دے۔

عِزرا : خودغرض رومن۔ تیرے ظلم و ستم کا کفارہ دولت سے ادا نہیں ہوسکتا۔ دولت اور خطاب زندگی کے خیالی سائے ہیں۔ اگر تو تمام دنیا کی دولت سمیٹ کر مجھے دے دے، تو بھی یہ ان آنسوؤں کی قیمت نہیں ہوسکتی جو تیرے ظلم و ستم نے مظلوموں کی آنکھوں سے ٹپکائے ہیں۔

بروٹس : تو ظلم کر رہا ہے۔

عِزرا : تجھ سے تھوڑا۔

بروٹس : تو بے رحم ہے۔

عِزرا : تجھ سے کم۔

© NCERT not to be republished

بروٹس : تو جہنم میں جائے گا۔

عِزرا : تیرے بعد۔

بروٹس : تو نہیں؟

عِزرا : نہیں۔

بروٹس : کب تک؟

عِزرا : موت تک۔

بروٹس : اچھا تو دونوں کو حوالۂ عذاب کرو۔ موت کے کڑوے پیالے کو اور زیادہ کڑوا بنانے کے لیے، باپ سے پہلے بیٹی کو کباب کرو۔

حنّا : ابا پیارے ابا۔ مرنے سے پہلے مجھے برکت دو کہ میرے دل سے موت کا خوف نکل جائے اور عورت کی فطرت بات پر جان دینے والے مرد کے ارادے سے بدل جائے۔

عِزرا : اُف! اس لڑکی کی محبت اور میرے ارادے میں جنگ شروع ہوگئی۔ بچاتا ہوں تو یہودی مذہب کی برکت اور نجات سے محروم رہی جاتی ہے اور نہیں بچاتا تو جنگل کی سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح بھاڑ میں جھونک دی جاتی ہے۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

بروٹس : عِزرا۔ دنیا کے کسی باپ کے کلیجے میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنی اولاد کی دردناک موت اپنی آنکھ سے دیکھ سکے۔ عقل سے پھر صلاح لے۔ تو دو حرف دے کر اس کی زندگی مجھ سے مول لے سکتا ہے۔

بروٹس : جب اسے تبدیل مذہب سے انکار ہے، تو دیر بے کار ہے۔ ڈال دو کڑھاؤ میں۔

عِزرا : بروٹس۔ اس پر رحم کر۔

بروٹس : نہیں

عِزرا : اسے چھوڑ دے۔

بروٹس : ہرگز نہیں۔

عِزرا : اس کی زندگی بھیک میں دے دے۔

بروٹس : کبھی نہیں۔ اگر اپنی اور اس کی زندگی کا پیار ہو تو وہ سوال جس کو میں دہراتے دہراتے تھک گیا ہوں اس کا جواب دینے کو تیار ہو۔

عِزرا : اچھا بتا تا ہوں۔

بروٹس : بتا تا ہوں؟

عِزرا : ہاں۔

بروٹس : تو بول

عِزرا : ایک شرط سے۔

بروٹس : بیان کر

عِزرا : ان کو تاکید کر دے کہ جس وقت میں تیری لڑکی کا حال بیان کر چکوں تو پس و پیش کے خیال کو دل سے نکال دیں اور بغیر دوسرا حکم پائے اس لڑکی کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیں۔

بروٹس : میں اس شرط کو منظور کرتا ہوں۔

عِزرا : دل و جان سے؟

بروٹس : دین و ایمان سے۔

عِزرا : اچھا تو سنو۔ شہر روما کے جلنے سے دو برس پہلے کا واقعہ ہے کہ تو نے محض سلام نہ کرنے کے جرم میں میری پانچ برس کی بچی کو اس کی ماں کی گود سے زبردستی چھین کر شیروں کے پنجرے میں ڈال دیا تھا۔ مگر اب ایک یہودی کا سلوک دیکھ کہ اُس وقت جب کہ ظالم نیرو کے حکم سے تمام شہر میں آگ لگی ہوئی تھی میں نے تیرے جلتے ہوئے محل میں گھس کر تیری چھ ماہ کی اکلوتی بچی کو موت کے منھ سے باہر نکالا اور انتقام اور کینہ کو جس سے میرا سینہ جل رہا تھا، بھول گیا اور اسے اپنی اولاد کی طرح پالا۔

بروٹس : تو نے نکالا؟ تو نے پالا؟

عِزرا : ہاں میں نے۔ میں نے ظالم رومن۔ ایک یہودی نے اور اس یہودی نے جسے تم ٹھوکریں مارتے تھے۔ جسے کتا سمجھ کر دھتکارتے تھے۔

روئی جو اس کے حال پہ، اُس چشمِ نم کو دیکھ
اپنے ستم کو دیکھ، ہمارے کرم کو دیکھ

بروٹس : مگر وہ کہاں ہے؟

عِزرا : کیا جن آنکھوں سے خدا کی ہزاروں قوتوں کو دیکھ کر بھی اُسے شناخت نہیں کر سکتے، ان آنکھوں سے اپنی لڑکی کو بھی

نہیں پہچان سکتے؟ دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ خون آپ سے آپ جوش مارے گا۔ اگر تمھارا ہی لہو ہوگا تو رگوں کے اندر سے پکارے گا۔

بروٹس : نہیں عِزرا نہیں۔ تو مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ تیر و تلوار سے نہیں مار سکتا، اس لیے جھوٹی خوشی دلا کر دیوانہ بنا دینا چاہتا ہے۔

عِزرا : وہ دیکھ۔ تیرے سامنے ہڈی اور خون سے بنا ہوا ایک آئینہ کھڑا ہے۔ اُسی آئینے میں تجھے، تیری کھوئی ہوئی لڑکی کی صورت نظر آئے گی۔ جو تیرے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے گی۔

بروٹس : یہ تو ایک یہودن لڑکی ہے۔

عِزرا : یہودن نہیں، رومن نژاد ہے۔ میری نہیں تیری اولاد ہے۔

بروٹس : میری؟

عِزرا : ہاں تیری۔ یہی وہ لڑکی ہے جسے میں نے بھڑکتی ہوئی آگ سے باہر نکالا اور اپنی اولاد بنا کر حنّا کے نام سے پالا۔

بروٹس : اس کا ثبوت؟

عِزرا : تیرے خاندان کی یادگار یہ تعویذ و عقیق کی مالا۔ ؎

خدا کی دین سے ملتا ہے یہ نصیبوں سے
ہے رحم سیکھنا تو سیکھ ہم غریبوں سے

بروٹس : ٹھیک یہ وہی مالا ہے جو پیدائش کے روز نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے لڑکی کے گلے میں پہنائی تھی۔ پہچان لیا۔ وہی۔ وہی ...آ... میرے دل کا سرور... میری آنکھوں کا نور ...آ۔

حنّا : ابا جان۔

عِزرا : ٹھہرو۔ میرا وعدہ پورا ہو چکا۔ اب تمھارا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا۔ چلو۔ فکر و حیرت کو دل سے نکال دو اور باپ کے سامنے بیٹی کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دو۔

بروٹس : نہیں عِزرا۔ اب یہ نہیں ہوسکتا۔

عِزرا : نہیں ہوسکتا۔ کیوں نہیں ہوسکتا؟
حیرت اور خوف کی تصویریں بن کر حرکت کرنا کیوں بھول گئے؟ ثابت کرو کہ تم زندہ ہو۔

بروٹس : نہیں عِزرا نہیں۔ میری غرور کی زندگی ختم ہوگئی۔ میرے اقتدار کا سر بلند قلعہ ایک ہی زلزلے میں ریزہ ریزہ ہو کر اپنی

خاک میں کفن پوش ہوگیا۔

جب پڑی خود اپنے سر پر ضرب، عبرت ہوگئی
غیر کا بھی دکھ ہے دکھ ، مجھ کو نصیحت ہوگئی

تیسرا ایکٹ — تیسرا سین

دربار

(سب کا خوشی میں بیٹھے ہوئے دکھائی دینا)

بروٹس : میرے محسن عِزرا۔ میرے عزیز بھائی۔ اگرچہ محبت پدری کا کچھ اور ہی ارادہ ہے۔ مگر حنّا پر مجھ سے تمھارا حق زیادہ ہے۔ اس لیے جس دین و مذہب میں اس نے پرورش پائی ہے اسی دین و مذہب میں رہے گی۔ جس طرح آج تک تمھیں اپنا باپ کہتی رہی ہے۔ اُسی طرح ہمیشہ کہے گی۔

مارکُس : پیاری حنّا۔ میں تمھارا گنہ گار ہوں۔ اور جو سزا تجویز کرو اس کو بخوشی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

حنّا : میں تمھیں یہی سزا دیتی ہوں کہ جس طرح مجھے دھوکا دیا ہے، اسی طرح آئندہ کسی عورت کو دھوکا نہ دینا۔

آکٹیویا : پیاری بہن۔ جب تم رومن نسل اور رومن باپ کی اولاد ہو تو تمھارا بادشاہ تمھارے لیے شادی کے قانون میں ضرور ترمیم کر دے گا۔

بادشاہ : ایسا ہی ہوگا۔

آکٹیویا : اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اب جو دور تھا وہ قریب ہو۔ میری خوشی اور راحت میں تم برابر کی شریک ہو۔

حنّا : بس اب میں راحت، خوشی، آرام، اس جھوٹی دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہتی....تم دونوں جیو اور خوش رہو۔

آکٹیویا : تو بہن۔ تم اس جھوٹی دنیا میں تنہا رہ کر کیونکر زندگی بسر کرو گی؟

حنّا : میں.......

(حنّا کا گانا)

اپنے مولا کی میں جوگن بنوں گی
جوگن بنوں گی، بروگن بنوں گی
اپنے مولا.....

(پردہ)

(آغا حشر کاشمیری)

مشق

سوالات

1. ڈرامے کی تعریف اور اجزائے ترکیبی کی وضاحت کیجیے۔
2. آغا حشر کاشمیری کی ڈراما نگاری کے امتیازات پر روشنی ڈالیے۔
3. ڈراما 'یہودی کی لڑکی' کے اہم کرداروں پر تبصرہ کیجیے۔

© NCERT not to be republished

چے خف

1860 تا 1904

آنتوں پافلووچ چے خف شمالی کوہ قاف کی سرحدوں کے نزدیک روس کی ایک نسبتاً گم نام بندرگاہ تگان روگ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق جنوبی روس کے ایک تاتاری خاندان سے تھا۔ اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد 1879 میں چے خف ماسکو چلے گئے، یہاں انھیں ایک میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔

خاندان کی مالی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے چے خف نے افسانہ نویسی کی مشق شروع کردی۔ شہر کے معمولی اخباروں اور رسالوں میں ان کے مزاحیہ افسانے شائع ہونے لگے۔ اس سے چے خف کو کسی قدر معقول آمدنی بھی ہونے لگی۔ اس لیے تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ڈاکٹری کے بجائے افسانہ نویسی کو ہی اپنا ذریعۂ معاش بنالیا۔

1886 میں ان کا تعارف ایک مشہور نقاد گریگورووچ اور ماسکو کے سب سے بڑے اخبار کے ایڈیٹر سووورن سے ہوگیا۔ ان دونوں کی سرپرستی کی بدولت، روس کی ادبی دنیا میں چے خف کو ایک خاص حیثیت حاصل ہوگئی۔ جب سووورن کے اخبار میں ان کے افسانے شائع ہونے لگے تو انھوں نے مزاحیہ افسانے لکھنا ترک کردیا۔ اب ان کے افسانوں میں وہ خاص تحیّر آمیز رنگ پیدا ہوگیا تھا جو ان کی امتیازی صفت ہے۔

1890 میں مشرقی سائبیریا جاکر انھوں نے سزایافتہ مجرموں کی حالت کا معائنہ کیا۔ 1891 میں انھوں نے بڑی جانفشانی کے ساتھ، قحط زدہ لوگوں کی خدمت انجام دی۔

چے خف کو جوانی میں ہی دِق کی بیماری لاحق ہوگئی تھی۔ دھیرے دھیرے ان کا مرض زور پکڑتا گیا۔ آخر میں یہی بیماری ان کی موت کا باعث بنی۔

چے خف افسانہ نویسی میں ایک نئے اور نرالے طرز کے موجد مانے جاتے ہیں۔ عام طور سے ان کا ملنا جلنا متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں سے تھا۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر انھیں کی زندگی کے نقشے کھینچے گئے ہیں۔ کہانی کو معنی خیز بنانے کے لیے وہ

© NCERT not to be republished

غیر معمولی حادثوں کا سہارا نہیں ڈھونڈتے۔ ان کے افسانے سیدھی سادی حقیقت کی بہ دولت لطیف اور دلکش ہوجاتے ہیں۔ چے خف کی زندگی ہی میں ان کے اکثر افسانوں اور ڈراموں کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اردو زبان میں بھی چے خف کے بہت سے افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ چے خف کا شمار افسانے کی صنف کے سب سے ممتاز نمائندوں میں کیا جاتا ہے۔ اس نے اس فن میں عالم گیر شہرت حاصل کی ہے۔ مشرق و مغرب کی زبانوں کے کئی ادیب چے خف کے اسلوب کی تقلید کرتے ہیں اور چے خف کے افسانوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

5258CH03

کلرک کی موت

وہ رات بہت اچھی تھی، جب ایوان دمترچ چیرویا کوف جو پیشے سے ایک کلرک تھا، تھیٹر کی دوسری قطار میں بیٹھا دوربین کی مدد سے ”لے کلوش دے کارنویل“ نام کے کھیل سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ اسٹیج کی طرف دیکھ رہا تھا، اور اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا کہ دفعتاً اس کا چہرہ متغیّر ہوا، دیدے اوپر کی طرف چڑھ گئے، سانس رُک گیا...... وہ دوربین سے منہ ہٹا کر اپنی نشست پر دوہرا ہوگیا اور......آخ چھیں!!! یعنی اسے چھینک آئی ......اب یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کو حق ہے کہ جہاں بھی چاہے چھینکے ...... کسان، پولیس انسپکٹر یہاں تک کہ بڑے بڑے سرکاری افسر بھی چھینکتے ہیں ...... ہر شخص چھینکتا ہے ...... ہر شخص ...... چیرویا کوف کو ذرا بھی گھبراہٹ نہ ہوئی، اس نے جیب سے رومال نکال کر ناک پونچھی اور ایک صاحبِ اخلاق کی طرح اپنے چاروں طرف مڑکر دیکھا کہ میری چھینک کسی کے لیے خلل انداز تو نہیں ہوئی؟ اور تب تو اسے واقعی الجھن محسوس ہوئی، کیونکہ اس نے دیکھا

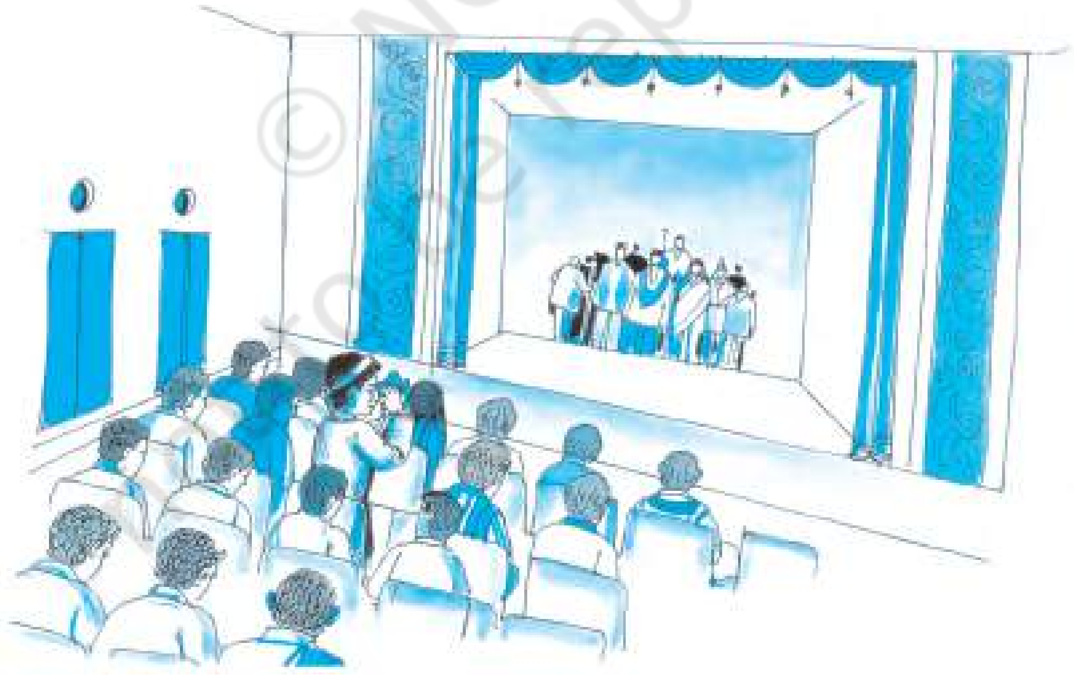

© NCERT not to be republished

کہ پہلی قطار میں بالکل اس کے سامنے بیٹھا ہوا ایک پستہ قامت بوڑھا شخص بڑی احتیاط سے اپنی گنجی چاند اور گردن کو اپنے دستانے سے صاف کررہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ بڑبڑاتا جارہا ہے...... چیرویاکوف نے پہچان لیا کہ یہ بوڑھا شخص وزارت رسل ورسائل کا سول جنرل بری ژالوف ہے۔

چیرویاکوف نے سوچا— ''یہ درست کہ یہ میرا افسر نہیں لیکن پھر بھی برا لگتا ہے، مجھے معافی مانگ لینی چاہیے......''

''مجھے معاف کردیجیے— میں...... یہ پہلے سے سمجھی بوجھی چیز نہیں تھی!''

''مہربانی کرکے آپ خاموش ہوجائیں تو اچھا ہے، مجھے سننے دیجیے!''

چیرویاکوف کچھ بوکھلا گیا۔ ندامت آمیز انداز میں مسکرایا— اور اسٹیج کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگا— وہ ایکٹروں کو دیکھتا رہا، لیکن اب اپنے کو خوش نصیب انسان محسوس نہ کرسکتا تھا— پریشانی اسے کھائے جارہی تھی— انٹرویل میں وہ بری ژالوف کے نزدیک پہنچا...... کچھ دیر تک ہچکچاتا رہا اور آخر جھجھک پر قابو پاکر سرگوشی کے انداز میں بولا:

''جناب عالی! میں نے آپ پر چھینک دیا...... معاف کیجیے...... آپ جانتے ہیں...... میرا مطلب یہ نہیں تھا......''

''اچھا...... میں تو اسے بھول بھی گیا تھا...... اسے دہرانا ضروری ہے کیا؟'' جنرل بولا— اس کا نچلا ہونٹ بے صبری سے پھڑک رہا تھا—

''کہتا ہے، میں بھول بھی گیا تھا— لیکن اس کی نظروں کا انداز مجھے پسند نہیں' بے چینی کے عالم میں جنرل کی طرف دیکھتے ہوئے چیرویاکوف نے سوچا— ''مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا، اسے سمجھنا چاہیے کہ میرا منشا نہیں تھا...... یہ تو فطرت کا قانون ہے، ورنہ وہ سمجھے گا کہ میں اس پر تھوکنا چاہتا تھا، اگر ابھی ایسا نہیں بھی سوچا تو بعد میں سوچ سکتا ہے!......''

گھر پہنچ کر چیرویاکوف نے اپنی بیوی سے اپنی غیر شریفانہ حرکت کا ذکر کیا— اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی نے پورے قصّے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی— یہ صحیح ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ چونک گئی تھی— لیکن جب معلوم ہوا کہ بری ژالوف ''ہمارا'' افسر نہیں ہے تو اسے اطمینان ہوگیا۔

''لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ تم جاکر معافی مانگ لو' وہ بولی— ''ورنہ وہ سمجھے گا کہ تمھیں کسی محفل میں بیٹھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔''

''یہی تو بات ہے! میں نے معذرت کرنے کی کوشش کی— لیکن اس کا رویّہ عجیب تھا— ایک بات بھی عقل کی نہیں کی— اس کے علاوہ بات کرنے کا وقت بھی نہیں تھا—''

دوسرے دن چیرویاکوف نے اپنی نئی وردی پہنی، بال کٹوائے اور بری ژالوف کے پاس اس واقعے کو سمجھانے کے لیے چل دیا...... جنرل کا ملاقاتیوں کا کمرہ درخواست گزاروں سے بھرا ہوا تھا— خود جنرل وہیں موجود تھا— اور درخواستیں لے رہا تھا— چندلوگوں سے ملاقات کے بعد جنرل نے چیرویاکوف کے چہرے پر نظر ڈالی—

''حضور کو یاد ہوگا کہ کل رات ''ارکیدیا'' میں......'' کلرک نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے ......ار ...... چھینک دیا تھا اور ......ار......ایسا ہوا کہ......میری درخواست ہے......''

''ہش! یہ کیا بکواس ہے!'' جنرل بولا— ''تمھیں کیا چاہیے؟'' اس نے دوسرے شخص سے مخاطب ہوکر پوچھا—

''میری بات بھی نہیں سنے گا!'' چیرویاکوف نے سوچا اوراس کا رنگ زرد پڑ گیا— ''اس کے معنی یہ ہیں کہ غصّے میں ہے...... ایسے وقت تو میں چھوڑ نہیں سکتا......اسے سمجھانا ہی پڑے گا......''

آخری درخواست لینے کے بعد جب جنرل اپنے نجی کمرے میں جانے کے لیے مڑا تو چیرویاکوف بُدبداتا اس کے پیچھے چلا—

''معاف کیجیے، حضور! انتہائی شرمندگی کے احساس کی وجہ سے مجھے حضور کو تکلیف دینے کی ہمّت پڑ رہی ہے......''

جنرل نے اس طرح دیکھا کہ بس چیخنے والا ہے اور اسے چلے جانے کا اشارہ کیا—

''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں جناب!'' وہ بولا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا—

''مذاق!'' چیرویاکوف نے سوچا ''اس میں مذاق کی تو کوئی بات مجھے نظر نہیں آتی— اس کی عقل میں نہیں سماتی اور جنرل بنا ہے— اچھی بات ہے— اب میں ان حضرت کو اپنی معذرت سے پریشان نہ کروں گا— اب دوبارہ نہیں جاؤں گا۔ اُسے صرف خط لکھ دوں گا! بس اب بالکل نہیں جاؤں گا!''

گھر جاتے ہوئے چیرویاکوف یہی کچھ سوچتا رہا، لیکن اس نے خط نہیں لکھا— بہت سوچا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ لکھے کیا۔ اس لیے دوسرے دن اسے پھر جنرل کے یہاں جانا پڑا تاکہ معاملہ رفع دفع ہوجائے—

''کل میں نے حضور کو زحمت دینے کی جرأت کی تھی'' جنرل نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، چیرویاکوف نے اُس پر کوئی دھیان دیے بغیر کہنا شروع کر دیا: ''اس لیے نہیں کہ میں آپ کا مذاق اڑانا چاہتا تھا، جیسا کہ حضور نے فرمایا تھا— میں تو معذرت کے لیے آیا تھا، کہ میں نے چھینک کر آپ کو تکلیف پہنچائی......اور جہاں تک آپ کا مذاق اڑانے کا سوال ہے تو ایسی بات تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا— میری ہمت کیسے پڑ سکتی ہے! اگر ہم نے لوگوں کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا تو پھر کوئی عزّت ہی باقی نہ رہ جائے گی ......اپنے سے بڑوں کی عزّت ہی نہ رہ جائے گی......''

''نکل جاؤ یہاں سے!'' جنرل چیخا— غصّے کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا اور نیلا پڑ گیا تھا —

''جی — کیا؟'' چیرویاکوف جو خوف سے سہم گیا تھا، ہکلانے لگا —

''نکل جاؤ!'' جنرل نے پاؤں پٹکتے ہوئے دہرایا —

چیرویاکوف کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو— وہ دروازے کی طرف مڑا تو اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا، نہ کچھ نظر آ رہا تھا — سڑک پر پہنچا اور چلتا گیا— لڑکھڑاتا ہوا وہ بالکل بے حِس ہوگیا، اپنے گھر پہنچا— اور اپنی سرکاری وردی پہنے پہنے جس حلیے میں تھا، اسی میں صوفے پر لیٹ گیا اور...... مرگیا —

(چے خف)

(روسی سے ترجمہ: ظ— انصاری)

مشق

سوالات

1. چیرویاکوف کو ایک صاحبِ اخلاق انسان کیوں کہا گیا ہے؟
2. دفعتاً چھینک آنے پر چیرویاکوف کا ردِّعمل کیا تھا؟
3. آپ کے نزدیک جنرل بری ژالوف کے کردار کا کون سا پہلو ناپسندیدہ ہے؟
4. چیرویاکوف کی موت کا سبب کیا ہے؟

© NCERT not to be republished

ویکوم محمد بشیر

1910 تا 1994

ویکوم محمد بشیر کی ولادت کیرالا میں ہوئی۔ ان کے والد عمارتی لکڑی کے ٹھیکے دار تھے۔ کاروبار میں بڑے نقصان سے دوچار ہونے کی وجہ سے ان کا گھرانا غریبی اور تنگ دستی کا شکار ہوگیا۔

محمد بشیر بچپن ہی سے بڑے ذہین اور ملنسار انسان تھے۔ نہایت حسّاس طبیعت رکھتے تھے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں وہ آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ اس کی وجہ سے انھیں اسکول چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ ان کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئیں کہ ان کی وجہ سے انھیں کیرالا بھی چھوڑنا پڑا۔ وہ بے سروسامانی کے عالم میں ملک کے مختلف حصّوں میں گھومتے پھرے اور طرح طرح کے لوگوں سے ملتے جلتے رہے۔ یہ دور تجربات کے لحاظ سے ان کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھیں رفتہ رفتہ یقین ہوتا گیا کہ زندگی اپنی رنگارنگی کے باوجود دنیا میں ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی پیدائش اور موت کے درمیانی وقفے کو کسی نہ کسی طور گزار دینے کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔

محمد بشیر نے 1937 کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر 27 سال تھی۔ وہ زندگی کا جو وسیع اور رنگا رنگ تجربہ حاصل کر چکے تھے، اس سے بہت کم لوگ گزرتے ہیں۔ دراصل یہی تجربات بشیر کی زندگی کے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ویکوم محمد بشیر کی پہلی اہم تخلیق ''بچپن کی ساتھی'' (مطبوعہ 1944) ہے جسے انھوں نے اپنی کتابِ زندگی کا ایک ورق قرار دیا۔ اس کہانی نے ملیالم کے افسانوی ادب کو نئی راہ دکھائی۔ محمد بشیر کی کہانیاں زندگی کی حقیقتوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کی بنیاد ان کے حقیقی تجربے تھے۔ وہ اپنی بات نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم انداز میں لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ملیالم ناول اور افسانے کی زبان پر ان کی تخلیقات کے گہرے اثرات ہیں۔ اس کا اعتراف کئی نقادوں نے کیا ہے۔

ویکوم محمد بشیر کو ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ 1970 میں ساہتیہ اکادمی کی

فیلوشپ ملی۔ 1982 میں حکومت ہند نے ''پدم شری'' کا خطاب دیا اور 1987 میں کالی کٹ یونیورسٹی نے اپنے اس عظیم فنکار کو جو رسمی تعلیم حاصل نہ کر سکا تھا، ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی سند عطا کی۔

محمد بشیر نے انتقال سے پہلے اپنا آخری مضمون ان الفاظ پر ختم کیا تھا: ''میں اپنے سفر کے خاتمے پر پہنچ رہا ہوں۔ کون جانے شاید یہ کسی دوسرے سفر کا آغاز ہو۔ وقت صرف خدا کے خزانے میں ہے، وہی میری راہ متعین کرے گا۔ میں دنیا کی خوش حالی کی تمنّا کرتا ہوں اور ہر فرد و بشر کی مسرت اور اس کے سکون و اطمینان کی دعا کرتا ہوں۔''

© NCERT not to be republished

جنم دن

مکرام کی آٹھویں تاریخ ہے، آج میرا جنم دن ہے۔ میں اپنے معمول کے خلاف صبح سویرے ہی اٹھ گیا۔ نہادھوکر کھدّر کی قمیض ، دھوتی اور سفید کینوس کے جوتے پہنے اور آرام کرسی پر تکیہ لگا کر بجھے ہوئے دل سے دراز ہوگیا۔ میرا پڑوسی میتھیو جو بی۔اے۔ کا طالب علم تھا، مجھے اتنے سویرے بیدار دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے مسکرا کر مجھے سلام کیا۔

''ہیلو! گڈ مارننگ'' اس نے انگریزی میں کہا۔

''جی!'' میں نے جواب دیا۔''گڈ مارننگ۔''

اس نے پوچھا — ''آج آپ اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے...... کیا کہیں جانا ہے؟''

''نہیں''، میں نے بتایا : ''آج میرا جنم دن ہے۔''

''آپ کا برتھ ڈے''اس نے انگریزی میں پوچھا؟

''جی ہاں''

''خوشی کا یہ دن تمھاری زندگی میں بار بار آئے۔''

''شکریہ''

میتھیو اپنے دانتوں میں برش دبائے ہوئے غسل خانے میں داخل ہوا۔ چاروں طرف سے شور وغل کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان ملی جلی آوازوں میں پیار کے نغمے بھی شامل تھے۔ وہ لوگ طالب علم اور کلرک تھے۔ ''کیا ان میں سے کسی کو کوئی پریشانی تھی؟'' ان کے لیے زندگی تو بہت خوشگوار تھی، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ایک کپ چائے کس طرح مل سکے گی۔ دوپہر کا کھانا یقینی تھا۔ کل جب میں بازار جارہا تھا تو حامد نے مجھے بغیر کسی وجہ کے دوپہر کے کھانے کی دعوت دے دی۔ وہ ایک معمولی سا شاعر لیکن امیر آدمی ہے، لیکن میں لنچ کے وقت تک بغیر چائے کے نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ میتھیو کا بوڑھا نوکر اس کے لیے چائے بنانے میں مصروف ہے۔ میرا کمرہ میتھیو کے باورچی خانے کا اسٹور بنا ہوا تھا۔ مالک مکان نے آٹھ آنے ماہوار پر مجھے کرایے پر دیا تھا۔ یہ پوری عمارت میں سب سے چھوٹا کمرہ ہے۔ میری آرام کرسی، میز، الماری اور پلنگ کے بعد مشکل سے سانس لینے کو جگہ بچتی ہے۔ احاطے کی دیوار سے گھری تین عمارتوں کے تمام کمروں میں طالب علم اور کلرک رہتے ہیں۔ میں واحد آدمی ہوں جسے مالک مکان پسند نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پابندی سے کرایہ ادا نہیں کرتا۔

آج میرا جنم دن ہے۔ میں اپنے گھر سے دور ہوں۔ میرے پاس پیسے بھی نہیں اور قرض لینے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں، وہ خود میرے دوستوں کے ہیں۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے اپنا کہہ سکوں۔ میتھیو نے جب مجھے جنم دن پر بہت سی نیک خواہشات پیش کیں تو میرا دل غم زدہ ہوگیا۔

سات بجے: مجھے یاد آرہا ہے۔ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے میں نے سوچا: کم سے کم اس روز مجھے کسی غلط کام سے بچنا چاہیے۔ آج کے دن مجھے کسی سے قرض نہیں لینا چاہیے اور آج کوئی غلط بات نہیں ہونی چاہیے۔ آج کے ''میں'' کو میرے ان سینکڑوں رنگ بدلتے چہروں سے بالکل مختلف ہونا چاہیے جو ماضی کے سفید وسیاہ شب وروز میں نظر آرہے ہیں۔ آج میری عمر کتنی ہوگئی؟ پچھلے سال کے مقابلے میں ایک برس اور بڑا ہوگیا ہوں...... پچھلے سال...... چھبیس (26) نہیں بتیس (32) یا سینتالیس (47)؟

میرا ذہن بے حد پریشان تھا۔ میں نے اُٹھ کر آئینے میں دیکھا: میں اتنا بڑا تو نہیں ہوں۔ ایک خاصا منفرد چہرہ، اونچی اور کشادہ پیشانی، ٹھہری ٹھہری آنکھیں، ایک خمیدہ تلوار کی طرح باریک مونچھیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی برا نہیں تھا۔ اس سوچ کے دوران مجھے ایک ایسی چیز نظر آئی جس سے مجھے دھکّا لگا۔ میرے کان کے اوپر کالے بالوں کے درمیان سفید لکیر سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کوشش کر کے اسے کھینچ کر نکال دیا۔ پھر میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پشت پر سے میرا سر خاصا ہموار تھا۔ سر پر ہاتھ پھیرنے کے دوران مجھے سر میں ہلکا سا درد محسوس ہوا۔ ممکن ہے کہ چائے نہ پینے کی وجہ سے ہو۔

نو بجے: ہوٹل کے مالک نے دور سے دیکھ لیا اور وہ چہرہ بسورتا ہوا اندر واپس چلا گیا۔ ہوٹل کا مَیلا کچیلا چھوکرا جس نے چائے بنائی تھی، نقد پیسے مانگنے لگا۔

میں نے کہا : ''ارے بھائی، پیسے کل دے دوں گا۔''

اسے مجھ پر اعتبار نہیں تھا : ''آپ نے کل بھی یہی کہا تھا۔''

اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

''مجھے خیال تھا کہ مجھے آج کچھ پیسے مل جائیں گے۔''

''مجھے حکم ہے کہ جب تک پہلے کے پیسے نہ دے دیں آپ کو چائے نہیں دی جائے۔''

''اوہ''

دس بجے: میرے ہونٹ سوکھ گئے۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ دوپہر کی سخت گرمی کی وجہ سے میرا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اسی لمحہ آٹھ دس سال کی عمر کے پتلے دبلے زرد چہرے والے دو عیسائی لڑکے لکڑی کی کھڑاؤں بیچتے ہوئے میرے دروازے پر آئے۔ انھوں نے آواز لگائی: تین آنے جوڑا۔

''لڑکو! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن، اگر آپ جیسے لوگ بھی نہیں خریدیں گے تو پھر کون خریدے گا؟''

لڑکو! مجھے ضرورت نہیں ہے...... میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''اوہ''

ان کے چہروں پر بے اعتباری تھی۔ وہ اتنے معصوم تھے کہ ظاہر کے پیچھے حقیقت کو نہیں سمجھ پائے۔ میرے کپڑوں، میری آرام کرسی کو دیکھ کر مجھے سر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے لیکن آرام کرسی، قمیض، دھوتی، جوتے ...... ان میں سے کچھ بھی میرا نہیں ہے۔

میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میرا بدن بھی کیا میرا اپنا ہے؟ ہندوستان کا ہر شہر میں نے گھوما ہے اور کتنی الگ الگ جگہوں پر الگ الگ طرح سے رہتا رہا ہوں۔ میرا خون، میرا گوشت پوست اور میری ہڈّیاں تک ہندوستانی ہیں۔کنیا کماری سے کشمیر تک، کراچی سے کلکتہ تک۔ دراصل ہندوستان کے تقریباً ہر حصّے میں میرے دوست موجود ہیں۔ مرد، عورت، میرے سبھی دوست ایک ایک کرکے میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ پورے چاند کی چاندنی کی طرح معطّر میری محبت پورے ہندوستان میں پھیل جائے۔ میری یہ خواہش ہے، لیکن مجھے جاننے والا مجھ سے محبت کرنے والا کون ہے؟ میں سب کچھ ہوں لیکن واقعتاً میں کیا ہوں؟ 'آہ' مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے! درد سے میرا سر پھٹا جارہا ہے۔ کیونکہ میں نے چائے نہیں پی تھی؟ درد کی وجہ سے سر اٹھانے میں بھی تکلیف ہورہی تھی۔ بہتر ہے کہ میں جاکر کھانا کھاؤں۔ اسی سر درد کی حالت میں مجھے ایک میل کی مسافت طے کرنا ہے لیکن کم سے کم بھر پیٹ کھانا تو مل جائے گا۔

گیارہ بجے: حامد دکان پر نہیں تھا۔ کیا وہ گھر چلا گیا؟

زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلتا۔ ممکن ہے وہ بھول گیا ہو۔ میں اس کے گھر جاؤں تو؟

ساڑھے گیارہ بجے: حامد کے دومنزلہ گھر کے آہنی دروازے بند ہو چکے تھے۔ میں نے کھٹکھٹایا: ''مسٹر حامد''

ایک عورت نے جواب دیا: ''وہ نہیں ہیں۔'' وہ کہاں گئے ہیں؟ کوئی جواب نہیں۔ تنگ آکر واپس جانے سے پہلے میں نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔

میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سُنی۔ تھوڑا سا دروازہ کُھلا۔ ایک جوان خاتون دکھائی دی۔

''میں نے اس سے پوچھا کہ حامد کہاں گئے ہیں۔''

''انھیں فوری طور پر کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔''

''وہ کب واپس آئیں گے؟''

''شام کو دیر سے آئیں گے۔''

''شام کو دیر سے؟''

''جب وہ واپس آجائیں تو مہربانی کرکے انھیں میرے آنے کے بارے میں بتا دینا۔''

''میں کیا نام بتاؤں؟''

''میں کون ہوں؟''

''میں ...... اوہ ...... کچھ نہیں ، میں کیا بتاؤں؟ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔ ریت گرم خشک چینی کی طرح ہو رہی تھی ۔ جھیل کا پانی شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں بہت پریشان تھا۔ میری ہڈّیاں جل رہی تھیں ۔ بھوک اور پیاس ۔ میں فاقے سے تھا۔ مجھے اتنی بھوک لگ رہی تھی کہ اگر مٹّی ملتی تو اس کو بھی کھا لیتا۔ میری بھوک کی شدت اس احساس کی وجہ سے اور بڑھ گئی کہ میرے پاس کھانا حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ شب و روز کا ایک لامتناہی سلسلہ میرے سامنے تھا لیکن کھانا ملنے کی کوئی توقّع نہیں تھی ۔ میں نقاہت سے گرا جا رہا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے : میرے شناسا میرے پاس سے اس طرح سے گزر گئے کہ جیسے انھوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں ۔

''اے میرے دوستو! میرے جنم دن پر میرے لیے خوشی کی دعائیں کرو۔''

میں اپنے آپ سے سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا۔ ان کے سائے میرے قریب سے گزرتے گئے ۔ ایسا کیوں ہوا کہ میرے دوستوں نے مجھے دیکھ کر مجھ سے بات تک نہیں کی؟

کیا یہ اس وجہ سے تو نہیں تھا کہ ایک سی ۔ آئی ۔ ڈی ۔ کا آدمی میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

ایک بجے : میں مسٹر ''پ'' کے پاس پہنچا جو پہلے ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے اور اب ایک دکان کے مالک ۔ مجھے بھوک کی شدّت میں مشکل سے نظر آ رہا تھا۔ ''پ'' نے پوچھا کہ ''انقلاب'' آنے میں کتنی دیر ہے۔

''بہت جلد آنے والا ہے۔''

''اہا ۔ ہا ۔ کیا کوئی خاص بات؟

''ارے کوئی بات نہیں ، بس یوں ہی آ گیا۔''

میں اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے بہت سے مضامین اس کے نام سے شائع ہو چکے تھے ۔ اپنی شان دکھانے کی غرض سے اُس نے بہت سے پُرانے پرچوں کو یکجا کر کے جلد بندھوائی تھی ۔ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اس کو دیکھنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس سے آواز آ رہی تھی ''میں ایک کپ چائے پینا چاہتا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں۔'' ''پ'' مجھ سے چائے کے لیے کیوں نہیں پوچھ رہا ہے؟ کیا اُسے میری تکان نظر نہیں آ رہی تھی ۔ وہ سنجیدگی سے گلّے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں گونگا بنا ہوا گلی کی طرف دیکھنے لگا۔ دو بھکاری لڑکے کوڑے کے ڈھیر میں پڑے ہوئے ایک ڈوسے کے ٹکڑے پر جھگڑ رہے تھے ۔ میرے پورے وجود نے ایک خاموش التجا کی ۔

''ایک کپ چائے'' — ''پ'' نے اپنا بکس کھولا اور اس میں سے ایک آنہ نکال کر ایک لڑکے کو دے دیا۔

''چائے لاؤ'' اس نے کہا۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ لڑکا چائے لینے کے لیے چلا گیا ''پی'' نے لڑکے کے لائے ہوئے چائے کا کپ لے کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا تم چائے پیو گے؟''

میں نے کہا ''نہیں'' اور میں اپنے جوتے کے فیتے باندھنے کے بہانے جھک گیا۔ ''پی'' نے شکایت کی— ''تم نے مجھے اپنی کوئی کتاب نہیں دی۔''

''میں ضرور دوں گا۔''

''میں ان پر تبصرے پڑھتا رہا ہوں۔''

''خوب!'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن جب دل بجھا ہوا ہو تو چہرے پر مسکراہٹ کیسے آسکتی ہے؟

میں اُٹھا اور سڑک پر چل دیا۔

سی۔آئی۔ڈی۔ کا آدمی میرا تعاقب کر رہا تھا۔

دو بجے: میں تھکا ماندہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ ایک اجنبی عورت جو عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھی، میرے دروازے پر آئی۔ وہ کسی دور دراز علاقے سے آئی تھی۔ اس کا شہر سیلاب کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا۔

''بہن، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کہیں اور جاؤ۔''

''اوہ'' میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ کورا جواب پا کر اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔ کیا مہک چھوڑ گئی۔

تین بجے: اگر میں کسی سے قرض لیتا ہوں تو اس میں کیا بات ہے؟ میری نقاہت انتہا کو پہنچ چکی تھی، عجب بے بسی کا عالم تھا۔ میں کس کے پاس جاؤں؟ میرے ذہن میں بہت سے نام آرہے تھے لیکن کسی سے قرض لینا اپنی خودداری کو مجروح کرنا ہے.......... کیا میں خودکشی کر لوں؟ موت کیسی ہوگی؟

ساڑھے تین بجے: میری زبان لڑکھڑا گئی۔ کاش میں اپنے آپ کسی سمندر کے ٹھنڈے پانی میں ڈوب سکتا! اسی حالت میں پڑا ہوا تھا کہ مجھے کچھ ایڈیٹروں کے خط ملے۔ ان کا مطالبہ واپسی ڈاک میں کہانیاں مانگنے کا تھا۔ خطوں کو ایک طرف پھینک کر میں بے بسی سے پڑا رہا۔ بینک کلرک کرشنا پلّے کا ملازم لڑکا ماچس مانگنے آیا۔ میں نے اس سے پانی کا ایک گلاس منگوا کر پیا۔

''مالک، کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟'' لڑکا جاننا چاہتا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

تو پھر...... ’’کیا آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے؟‘‘

’’نہیں‘‘

’’کیوں نہیں کھایا؟‘‘

بچّے کا معصوم چہرہ، کالی آنکھیں، کالے دھبّے لگا ہوا کپڑا، جسے وہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے آہستہ سے پکارا’’ مالک۔‘‘

’’ہوں‘‘ میں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

’’میرے پاس دو آنے ہیں۔‘‘

’’تو‘‘

اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

’’اگلے مہینے میرے گھر جانے سے پہلے آپ یہ پیسہ واپس دے دیں۔‘‘

میں اس کی بات سے بہت متاثر ہوا۔

’’لے آؤ‘‘ میں نے کہا۔

میری بات پوری طرح سُنے بغیر ہی وہ چلا گیا۔

اسی وقت میرا دوست گنگا دھر آ گیا۔ وہ سفید کھادی کی دھوتی اور سفید کھدّر کا جبّہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کندھے پر نیلے رنگ کی شال پڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ مجھے آرام کرسی پر بے تعلّق سا پڑا دیکھ کر اس نیتا نے مجھ سے کہا: ’’تم تو بڑے بورژوا ہوگئے ہو۔‘‘ اگرچہ میرا سر چکرا رہا تھا پھر بھی میں ہنس پڑا۔ مجھے تعجّب ہو رہا تھا کہ یہ نیتا جو کپڑے پہنے ہوئے ہے، کس کے ہیں! میری باطنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہر جاننے والے قومی کارکن کی تصویر گزر رہی تھی۔

’’تم کیوں ہنس رہے ہو؟‘‘ گنگا دھر نے پوچھا۔

’’ارے، کچھ نہیں، بیٹے، مجھے تمہارے حلیے کو دیکھ کر ہنسی آ گئی۔‘‘

’’مذاق بند کرو اور میری بات سنو۔ ایک بڑی پریشانی آ پڑی ہے۔ قریب تین ہزار مزدوروں نے ہڑتال کردی۔ وہ ڈیڑھ ہفتے سے بھوکے مر رہے ہیں۔ یہ مصیبت بڑھ سکتی ہے۔‘‘

’’کیا بات ہے؟ اخباروں میں تو یہ خبر پڑھی نہیں۔‘‘ ’’اخباروں میں اس خبر کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔‘‘

© NCERT not to be republished

''یہ اچھی بات ہے۔''

''اس کے بارے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو۔'' اس سلسلے میں ایک جلسہ ہو رہا ہے، میں اس کا صدر ہوں۔ وہاں کشتی سے پہنچنے کے لیے ایک آنے کی ضرورت ہے۔ آج میں نے کچھ نہیں کھایا......

''تم میرے ساتھ چلو۔''

''بیٹے یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ کئی روز سے میرے منھ میں کھیل تک نہیں گئی ہے۔ آج میرا جنم دن ہے۔ میں نے اب تک کچھ نہیں کھایا۔ پھر بھی دیکھتے ہیں، تھوڑا انتظار کرو۔'' پھر گنگا دھر، مزدوروں، قومی کارکنوں اور گورنمنٹ کے بارے میں بولنے لگا۔ میں اخبار کے ایڈیٹروں اور ادیبوں کے بارے میں ذکر کرتا رہا۔ اس دوران ملازم لڑکا واپس آیا۔ میں نے اس سے ایک آنہ لیا اور چائے، بیڑی اور ڈوسا وغیرہ لانے کو کہا۔ وہ چائے اور چند بیڑیاں، ایک ڈوسا جو چھوٹا سا پاپڑ لگ رہا تھا، لے آیا۔ کسی امریکی اخبار کے کاغذ کا ٹکڑا جس میں ڈوسا لپٹا ہوا تھا۔ اس پر ایک تصویر چھپی ہوئی تھی، جو میری توجّہ کا مرکز بن گئی۔ میں اور گنگا دھر ڈوسا کھانے لگے۔ ایک گلاس پانی پی کر چائے پی اور بیڑی جلائی اور ایک آنا گنگا دھر کو دے دیا۔ چلتے وقت اس نے مذاقاً مجھ سے کہا۔ ''آج آپ کا جنم دن ہے نا۔ کیا آپ دنیا کے نام کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا، ''ہاں بیٹا'' انقلاب سے متعلق ایک پیغام!

''مجھے بتاؤ''

''ہر جگہ انقلاب کے شعلے بھڑکا دو۔ موجودہ سماجی نظام کو جلا کر راکھ کر دو اور ایک نئی دنیا پیدا کرو۔''

''بہت اچھا، یہ پیغام مزدوروں تک پہنچا دوں گا۔''

گنگا دھر تیزی سے چلا گیا۔ میں متعدد قومی کارکنوں اور ادیبوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ سب لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیٹ کر سوچتے سوچتے میں نے اخبار کا وہ ٹکڑا اٹھایا جس میں ڈوسا لپٹا ہوا تھا۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ مالک مکان غصے کے عالم میں دروازے سے میری طرف آیا۔ میں شش و پنج میں تھا کہ اس سے کیا بہانہ کروں گا۔ اس لیے میں تصویر دیکھنے لگا۔ تصویر میں ایک ایسا شہر تھا جو فلک بوس عمارتوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان عمارتوں کے درمیان ایک آدمی سر اُٹھائے آہنی زنجیروں سے بندھا ہوا زمین پر کھڑا تھا لیکن وہ نہ تو زنجیروں کی طرف دیکھ رہا تھا اور نہ ہی زمین کی طرف۔ وہ بہت دور ستاروں سے پرے لامحدود خلا میں شعائیں بکھیرتے ہوئے روشنی کے ایک بڑے منبع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک کُھلی کتاب رکھی تھی۔ اس کے کھلے دو صفحات پر درحقیقت بنی نوع انسان کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ وہ تحریر اس طرح تھی۔'' حالانکہ وہ زمین پر زنجیروں سے بندھا تھا لیکن

اس کی نظریں زمان ومکاں سے ماورا مستقبل میں ہونے والی شاندار ترقّی پر تھیں۔

کہیے جناب، مالک مکان نے سرد مہری کے ساتھ کہا۔

''کیا آج آپ کرایہ ادا کر سکتے ہیں؟''

میں نے کہا، ''مجھے اب تک میرا پیسہ نہیں ملا ہے۔ چند روز میں ضرور ادا کر دوں گا۔'' ''ایسی زندگی کس کام کی؟'' اس نے پوچھا۔

یہ بات صحیح تھی۔ ایسی زندگی کس کام کی؟

تین سال پہلے میں اس عمارت میں آیا تھا۔ میں نے باورچی خانوں کی مرمّت کرائی تھی۔ ان میں سے ہر ایک خاصے اچھے کرائے پر اُٹھا ہوا ہے۔ اب میں نے چوتھا اسٹور روم بنا دیا ہے۔ تب وہ مجھ سے یہ کہتا ہے کہ یہ زیادہ کرائے پر اُٹھ سکتا ہے۔ اگر میں اس کا زیادہ کرایہ نہیں دے سکتا تو میں اس کو خالی کر دوں۔

نہیں۔ میں اس کمرے کو خالی نہیں کروں گا!

چار بجے: میں اس ملک سے اُکتا گیا ہوں۔ اس شہر میں دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے، مجھے یہاں وہی دکانیں، وہی سڑکیں اور وہی چہرے نظر آتے ہیں اور وہی باتیں سننے میں آتی ہیں...... میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔

چھ بجے: شام سہانی تھی۔ ڈوبتا سورج خون کے ایک ایسے گولے کی طرح لگ رہا تھا جسے سمندر نے نگل لیا ہو۔ آسمان کے مغرب میں سنہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سمندر بیکراں نظر آرہا تھا۔ نزدیک ہی لہریں مارتی ہوئی جھیل تھی۔ اس کا ساحل کتنا پُرسکون تھا۔ من چلے نوجوان سگریٹ پیتے ہوئے چہل قدمی کر رہے تھے۔ نوجوان عورتیں شاندار ساڑیاں پہنے ہوئے دُزدیدہ نگاہوں اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں آرام کر رہی تھیں۔ دل لُبھانے کے لیے عشقیہ فلموں کے گیت بھی سُنے جا سکتے تھے۔ فضا میں پھولوں کی بھینی مہک گُھلی ہوئی تھی...... لیکن میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

سات بجے: ایک سپاہی گھر پر آیا اور مجھے دوبارہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے چکا چوند کر دینے والے پیٹرومیکس لیمپ کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ جب میں پولس والوں کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا تو ڈپٹی کمشنر ٹہلتے ہوئے میرے چہرے کے تاثرات کا بڑی توجہ کے ساتھ مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی میرے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی۔ ان نظروں میں کتنی حقارت تھی جیسے میں نے کوئی خوفناک جرم کیا ہو۔ مجھ سے ایک گھنٹے تک پوچھ تاچھ ہوتی رہی۔ کون کون میرے دوست ہیں؟ میرے پاس خط کہاں سے آتے ہیں۔ کیا میں کسی خفیہ تنظیم کا ممبر تو نہیں ہوں، جو حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہے؟

''میں آج کل کون سی نئی چیز لکھ رہا ہوں؟'' مجھے صحیح صحیح پوری بات بتانا چاہیے۔

''تم جانتے ہو کہ میں تمھیں شہر بدر کر سکتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں کہ میں بالکل بے بس ہوں۔ اگر صرف ایک سپاہی چاہے تو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال سکتا ہے۔''

ساڑھے سات بجے: میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور اندھیرے میں بیٹھا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ آج میرے کمرے میں روشنی بھی نہیں تھی۔ تھوڑا سا بھی مٹّی کا تیل کہاں سے لاتا اور بھوک کو مٹانے کے لیے کچھ کھانا بھی ضروری تھا۔ مجھے کھانا کون دے گا؟ کسی سے قرض بھی نہیں لے سکتا۔ اگر میتھیو سے کہا جائے تو؟ نہیں، میں چشمہ لگانے والے اس طالب علم سے قرض کے طور پر ایک روپیہ لوں گا۔ وہ اگلی عمارت میں رہتا ہے۔ اس نے اپنی حالیہ بیماری کے دوران انجکشنوں پر خاصی رقم خرچ کی تھی۔ آخر کار، وہ میری چار آنے والی دوا سے ٹھیک ہوا۔ اس کے بدلے میں وہ مجھے ایک مرتبہ سنیما دکھانے لے گیا تھا۔ اگر میں اس کے پاس جا کر ایک روپیہ مانگوں تو وہ انکار نہیں کر دے گا۔

آٹھ بج کر پینتالیس منٹ: راستے میں میں نے میتھیو کے بارے میں معلوم کیا۔ وہ سنیما دیکھنے گیا ہوا تھا۔ زور سے بولنے اور قہقہوں کی آواز سن کر میں دوسری عمارت کی بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں سے سگریٹ کے دھویں کی بو اور گیس کی لالٹین کی روشنی آ رہی تھی۔ میں بے بسی کا مجسّمہ بنا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے اپنی بات چیت جاری رکھی۔ قومی معاملات، سنیما، کالج کی لڑکیوں کی باتیں۔ ان لڑکیوں کا ذکر جو دن میں دو بار ساڑیاں بدلتی ہیں اور اس طرح کی بہت سی باتیں۔ میں بھی ان کی باتوں میں شامل ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔

نو بجے: میں نے اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن بستر پر پڑا رہا۔ مجھے دنیا کے بے بس غریب لوگوں کا خیال آیا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں کروڑوں لوگ بھوکے پڑے ہوں گے۔ میں بھی ان کروڑوں لوگوں میں سے ایک تھا۔ مجھ میں کیا خاص بات ہے؟ میں بھی ایک غریب آدمی ہوں اور بس، جبکہ میں اس طرح سے لیٹا ہوا سوچ رہا تھا............ میرے منھ میں پانی بھر آیا۔

میتھیو کے باورچی خانے سے سرسوں کے پروسنے کی آواز آ رہی تھی............ اور اُبلے ہوئے چاولوں کی خوشبو بھی۔

ساڑھے نو بجے: میں کمرے سے باہر آیا۔ میرا دل اتنی تیزی سے اُچھل رہا تھا جیسے کہ وہ پھٹ جائے گا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو! میں پسینے میں شرابور تھا۔ صحن میں کچھ دیر رُکا۔ قسمت سے بوڑھا نوکر ایک برتن اور لیمپ لیے ہوئے نکلا۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا چھوڑ دیا اور نل کی طرف چلا گیا۔ کم از کم اُسے دس منٹ ضرور لگیں گے۔ میں نے دروازہ کھولا اور باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔

دس بجے: میں پسینے سے شرابور باورچی خانے سے نکلا لیکن میرا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ جب بوڑھا آدمی واپس آ رہا تھا، میں نل کی طرف چلا گیا۔ تھوڑا پانی پیا اور ہاتھ، منھ، پاؤں دھوئے۔ کمرے میں پہنچ کر بیڑی سلگائی اور کش لینے لگا۔ میں بالکل تھک چکا تھا۔ اس لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے مجھے یہ خیال آ رہا تھا، کہیں بوڑھے کو پتا تو نہیں چل گیا۔ اگر ایسا ہے تو میتھیو کو ضرور پتا چل جائے گا اور دوسرے طالب علموں اور کلرکوں کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ کم سے کم اپنے جنم دن پر آرام سے سو تو سکوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ تب ہی ایک شخص میرے کمرے پر آیا۔

''ہیلو مسٹر......!'' میتھیو کی آواز آئی۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ میری نیند اڑ گئی۔ سارا کھایا پیا برابر ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ میتھیو کو پتا چل گیا ہے۔ بوڑھے کو پتا چل گیا ہوگا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا کہ اندھیرے میں یکا یک میں فلیش لائٹ کی زد میں آ کر پکڑا گیا تھا۔

میتھیو کیا پوچھنے والا تھا؟

مجھے ایسا لگا جیسے خوف کے مارے دم نکل جائے گا۔

''میں نے کہا: میں سنیما دیکھنے گیا تھا۔ وکٹر ہیوگو کی لا ئز یبل لگی ہوئی ہے۔ یہ پکچر آپ کو ضرور دیکھنا چاہیے۔''

''ہوں، ہوں''

''کیا آپ کھانا کھا چکے ہیں؟ مجھے قطعی بھوک نہیں ہے۔ راستے میں ہم لوگ ماڈرن ہوٹل چلے گئے تھے۔''

''بہت بہت شکریہ، میں کھانا کھا چکا ہوں۔''

''اوہ! تو آپ آرام کیجیے۔''

''گڈ نائٹ۔''

''اچھا! گڈ نائٹ۔''

(ویکوم محمد بشیر)
(مترجم: ضیاالرحمٰن صدیقی)

مشق

سوالات

1. اس افسانے کا عنوان ''جنم دن'' کیوں رکھا گیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
2. ''جنم دن'' افسانے کا خلاصہ بیان کیجیے۔
3. افسانہ نگار کے جنم دن کے واقعات میں کس واقعے نے آپ کو بے حد متاثر کیا اور کیوں؟
4. افسانے کے مرکزی کردار کی معاشی تنگدستی کا حال اپنے لفظوں میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished

نِرمَل ورما

2005 تا 1929

نرمل ورما ہندی زبان کے منفرد اور ممتاز فکشن نگار ہیں۔ وہ 3/ اپریل 1929 کو شملہ (ہماچل پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ اس کے بعد دہلی آگئے جہاں سینٹ اسٹیفنس کالج (دہلی یونیورسٹی) سے تاریخ میں ایم۔اے۔ کیا۔ کچھ عرصے تک تدریس کا کام بھی کیا۔ 1959 میں چیکوسلوواکیہ کے مصنفین کی انجمن کی دعوت پر پراگ (چیکوسلوواکیہ) چلے گئے اور سات سال تک وہیں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے کئی چیک شاہکاروں کے ہندی ترجمے کیے۔ اپنے قیام یورپ کے دوران انھوں نے ''ٹائمس آف انڈیا'' کے لیے وہاں کے تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و سماجی مسائل پر کئی فکر انگیز مضامین اور رپورتاژ بھی لکھے۔

نرمل ورما ایک بے مثال تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے افسانہ، ناول، ڈراما، سفرنامہ اور ڈائری، غرض کہ کئی صنفوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ''پرندے'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں میں ''جلتی جھاڑی''، ''پچھلی گرمیوں میں''، ''بیچ بحث میں''، ''کوّے اور کالا پانی'' وغیرہ ہیں۔ نرمل ورما کے ناول ''وے دن''، ''لال ٹین کی چھت''، ''ایک چیتھڑا سکھ''، ''رات کا رپورٹر''، ''انتم ارنیہ'' ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ''چیڑوں پر چاندنی''، ''ہر بارش میں'' وغیرہ ان کے سفرنامے ہیں۔ تنقیدی اور تہذیبی مسائل پر مضامین کے کچھ مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔

نرمل ورما کو ان کی ادبی خدمات پر مختلف اداروں کی طرف سے متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، سادھنا سمّان، رام منوہر لوہیا سمّان، مورتی دیوی ایوارڈ، میتھلی شرن گپت سمّان اور بھارتیہ گیان پیٹھ کا انعام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ 2001 میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ نرمل ورما کا انتقال دہلی میں ہوا۔

© NCERT not to be republished

جلتی جھاڑی

میں اس شہر میں پہلی بار آیا تھا۔ سوچا تھا، چند دن رہ کر آگے چلا جاؤں گا لیکن بعض ناگزیر وجوہات سے یہاں رُک جانا پڑا۔ دن بھر ہوٹل میں رہتا اور جب اوُب جاتا تو اکثر گھومتے ہوئے اُس مقام کی طرف قدم بڑھ جاتے۔ اجنبی شہروں میں بھی ہر مسافر اپنے پسندیدہ گوشے ڈھونڈ لیتا ہے۔

کئی بار وہاں جانے کی طبیعت ہوئی۔ رات کو سستے ریسٹورینٹ کی تلاش کرتے وقت اکثر اس طرف نگاہ چلی جاتی یا کبھی ٹرام کی کھڑکی سے پُل پار کرتے ہوئے ایک دبی سی خواہش جاگ اٹھتی۔ دل چاہتا، یہیں اُتر جاؤں لیکن ایک ہلکی سی ہچک ابھر آتی اور میں اس کے نیچے دَب جاتا ہوں۔

وہ دن کچھ الگ سا رہا ہوگا۔ میں دن بھر ہوٹل کے کمرے میں سوتا رہا۔ کچھ ضروری خط لکھے اور انہیں پوسٹ کرنے کے بہانے باہر چلا آیا۔

واپسی میں مَیں نے جان بوجھ کر راستہ بدل لیا۔ ممکن ہے کہ میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا ہو۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ جب کبھی میں دن بھر سو کر باہر آتا ہوں تب خود کو ایک نئے سرے سے ڈھیلا چھوڑ دینے کی خواہش ہوتی ہے۔ خاص طور پر اجنبی شہروں میں جہاں ہمیں کوئی نہیں پہچانتا اور ہم کسی شرمندگی اور جھجک کے بغیر ایک راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر ہو لیتے ہیں۔

ایسا ہی پت جھڑ کا ایک دن تھا جب میں وہاں چلا آیا تھا۔ وہ ایک جزیرہ تھا۔ شہر کے کنارے جہاں پہاڑی شروع ہوئی ہے، ندی کے دو دھارے قینچی کی طرح اسے بیچ سے کاٹ گئے تھے۔ پُل کے نیچے لمبی گھاس پانی میں بھیگی رہتی تھی۔ کنارے پر دور دور لال تختوں کی بنچیں پڑی تھیں۔ ان دنوں یہ اکثر خالی رہتی تھیں۔ بالکل خالی بھی نہیں۔ پتّے لگاتار اُن پر جھڑتے رہتے۔ جب کبھی ہوا کا کوئی جھونکا انھیں اُڑا لے جاتا تو وہی جھونکا واپس مُڑ کر دوسرے پتّوں کو اُن پر بکھیر دیتا۔ وہ کبھی زیادہ دیر تک خالی نہیں رہتی تھیں۔ پانی بہتا رہتا۔ اس کی آواز کے ساتھ ہمیشہ ایک اور آواز دل میں آتی تھی .... کسی دن وہاں جاؤں گا۔

ایسے ہی ایک پت جھڑ کے دن میں وہاں چلا آیا تھا۔ کنارے کنارے چلتے ہوئے میں ان بچّوں سے الگ تھا جو پُل کے نیچے کھیل رہے تھے۔ انھوں نے شاید مجھے دیکھا بھی نہیں۔ وہ پتّوں کا ڈھیر بنا دیتے تھے اور انھیں ماچس سے جلا کر بھاگ جاتے تھے۔

© NCERT not to be republished

شام کی مدّھم دھوپ میں دھوئیں کے دائرے پھیل جاتے۔ ایک سوندھی بُو جزیرے کے اِرد گرد ہوا میں پھیل جاتی تھی۔

میں پُل سے دور چلا آیا۔ دوسری طرف پیڑوں کی ننگی شاخیں پانی کو چھوُ رہی تھیں۔ وہاں گیلی گھاس کا ایک ٹکڑا ندی کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ ڈھلان پر اُترتے ہی نگاہ اچانک اس پر ٹک گئی۔ پاؤں ٹھٹھک گئے۔

وہ بوڑھا آدمی تھا۔ ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھا تھا۔ بالکل خاموش، بے حس وحرکت۔ منھ میں پائپ دبی تھی، جو نہ جانے کب کی بجھ چکی تھی۔ ہاتھ میں مچھلی پکڑنے کا کانٹا تھا— ندی کے کنارے گندلے پانی میں دور تک ڈوبا ہوا لیکن اس کا دھیان کانٹے کی طرف نہیں تھا۔ وہ جزیرے سے پَرے شہر کے پُلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رہ رہ کر منھ میں دَبی پائپ ہل اٹھتی تھی۔

وہ جزیرے کا ساکت کنارہ تھا۔ میں بے مقصد گھومتا ہوا تھک گیا تھا۔ اپنا چمڑے کا بیگ میں نے بھیگی گھاس پر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

میرے بالکل قریب ایک ننگا درخت کھڑا تھا۔ بارش میں بھیگا لیکن گرم۔ اس کی گرمی دھیرے دھیرے مجھے چھوُ نے لگی۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس شہر میں پانی برستا رہا تھا۔ گھاس کے نیچے مٹّی نم تھی اور اتنی ملائم کہ پیر نیچے دبنے لگتے تھے۔

یہ پہلا دن تھا جب بارش تھمی تھی۔ بادل اب بھی تھے۔ کچھ جزیرے پر، کچھ ہٹ کر شہر کی پہاڑی پر لیکن اب وہ خالی اور ہلکے تھے اور ہوا میں اُڑتے معلوم ہوتے تھے۔

میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ اس دوران بوڑھے نے ایک بھی مچھلی نہیں پکڑی۔ ایک بار کانٹا ہلا تھا۔ اس نے لپک کر ڈنڈی کھینچی۔ میں نے سوچا، اب ایک تڑپتا ہوا گوشت کا لوتھڑا اوپر آئے گا۔ میں خود شاید اُتاؤلے پن میں پانی کے پاس چلا آیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے ندی سے کانٹا باہر نکالا۔ پھر میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ کانٹا خالی تھا۔ مچھلی بہت صفائی سے اپنا کھانا چُرا لے گئی تھی۔

ہم دونوں پھر اپنی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بوڑھے نے اپنے کانٹے میں چارہ بھرا اور پھر دور ہوا میں اُچھال کر اسے پانی میں ڈبو دیا۔ بہتے پانی پر ایک چوڑا سا دائرہ پھیل گیا۔ دھوپ میں پارے کی طرح چمکتا ہوا اور پھر مٹ گیا۔

اس نے اپنی پائپ دوبارہ سُلگا لی اور پُرانے اوورکوٹ کے کالر اوپر کانوں تک چڑھا لیے۔ پانی پر تیرتی دھوپ کا ایک حصّہ بچّوں کے لٹّو سا گھومتا ہوا کنارے آ لگتا تھا اور ٹوٹ جاتا تھا، لیکن بوڑھے کا دھیان اُدھر نہیں تھا۔ میں طے نہیں کر پایا کہ اس کی آنکھیں کس خاص مرکز پر ٹکی ہیں۔ اس کی آنکھیں کھلی ہیں یا بند، یہ بھی ٹھیک ٹھیک کہہ پانا مشکل تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ میرا گمان پختہ ہوتا گیا۔ یہ اندیشہ کس بات کے لیے تھا، میں آج تک ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا لیکن یہ سچ ہے کہ انجانے شبہات ضرور تھے۔ وہ صرف ایک بار مجھے دیکھ کر ہنسا تھا لیکن حیرت ہے کہ اُس وقت بھی اس نے مجھے پورے طور پر نہیں دیکھا تھا، میری طرف متوجّہ ہو کر اُسے ہنسنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اُسے میرے وجود کا ذرا بھی احساس نہیں۔ حالاں کہ میں اس کے اتنے قریب بیٹھا ہوں — یہ مجھے بے حد غیر فطری معلوم ہوا۔ انجانے شہر میں اپنائیت کی بھوک اتنی مستحکم ہوتی ہے، یہ اس سے پہلے میں نہیں جان پایا تھا۔

بے شک وہ کسی مخصوص شے پر اپنی آنکھیں ٹکائے ہوئے تھا، ایسا کچھ جو میری آنکھوں کے دائرے سے باہر تھا۔

لیکن میں نے کوشش کی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے شہر کا سب سے پرانا پُل تھا۔ اُس کے پَرے نیشنل تھیٹر کی دیواریں اور چھت اور بیچ میں پُل کا ٹاور جو شام کی ڈوبتی روشنی میں جھلملا رہا تھا، لیکن یہ ایسی چیزیں تھیں جنھیں اس شہر میں چلتے ہوئے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم روز دیکھتے تھے۔ ان میں کچھ خاص یا غیر معمولی کم از کم اس بوڑھے کے لیے تو نہیں تھا جو شاید برسوں سے اس شہر میں رہتا تھا۔ میرا گمان پھر بیدار ہونے لگا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے انوکھا یا بالکل علاحدہ......

لیکن کیا یہ آدمی دیکھ سکتا ہے؟ اچانک میرے ذہن میں یہ بے تُکا خیال اُبھرا۔ وہ بہت بوڑھا ہے۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا آیا۔ دھوپ دھیرے دھیرے اُترنے لگی۔ پورے جزیرے پر ایک منجمد خاموشی گھِرنے لگی۔ پتّے پانی پر جھڑتے تھے اور بہہ جاتے تھے۔

صرف دھوپ کے ٹکڑے باقی رہ گئے تھے— پتّھروں پر، ٹہنیوں پر۔ کچھ دیر بعد شام انھیں لے کر چلی جائے گی— صرف ہم دونوں وہاں بنے رہیں گے۔

لیکن نہیں ...... وہ جا رہا ہے۔ میری نگاہیں اچانک اوپر اُٹھ گئیں۔ وہ سچ مچ جا رہا تھا۔ اس نے مچھلی پکڑنے کے کانٹے کو پانی سے باہر نکال لیا۔ کینوس کی کرسی کو لپیٹ کر بغل میں دبا لیا۔ اس نے بہت پُرانا زرد باؤلر ہیٹ پہنا اور پائپ منھ سے نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ مچھلی پکڑنے کا جھولا جو خالی تھا اس نے کانٹے کی ڈنڈی پر لٹکا لیا تھا۔

نہ جانے کیوں اس لمحے میرے اندر ایک عجیب سی جُھرجھری پھیل گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں بہت پیچیدہ طریقے سے اُس آدمی پر منحصر ہو گیا ہوں اور اس کے جانے سے ہی میں وہ کھو دوں گا جو ایک مدّت سے میرے اندر پلتا رہا ہے۔ اس کا یہاں رہنا شاید میرے رہنے سے جڑا ہوا ہے لیکن اس لمحے شاید کچھ ہوا۔ شاید سوکھے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ یا شاید کوئی پتّھر پانی میں لُڑھک گیا ہوگا اور وہ چونک گیا۔ اس کے پاؤں دھرتی پر بندھے سے رہ گئے جیسے کسی نے اُسے پکڑ لیا ہو۔ اُس نے ایک بار پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ ندی کے بہتے پانی کی طرف اور پھر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا میرے سامنے سے نکل گیا۔

جاتے ہوئے اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ کچھ دیر تک جزیرے میں اس کے نیچے دبتے پتّوں کی چرمراہٹ سُنائی دیتی رہی۔ پھر سب پہلے جیسا خاموش ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں کچھ دیر پہلے بوڑھا مچھوارا بیٹھا ہوا تھا۔ گیلی مٹّی پر اُس کے جوتوں کے نشان اب بھی دکھائی دیتے تھے۔ بہت لمبے نہیں لیکن کافی چوڑے اور آگے کی طرف تھوڑے بے ڈول۔ وہ مجھے معمولی معلوم ہوئے اور زیادہ دیر تک میرا دھیان اُن پر نہیں ٹِک سکا۔

تھوڑا اور وقت گزرا۔ بعد میں جب میرا دھیان اپنی طرف گیا تو مجھے حیرانی سی ہوئی۔ دراصل ایک وقفے سے میں بغیر کسی خاص ارادے کے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے بوڑھے کی آنکھیں لگی تھیں۔ کنارے کے پاس لگی جھاڑیوں پر کچھ پرندے اُڑے۔ پُشتے سے کچھ دور ایک بہت پُرانے گرجا گھر کے شیشے پر آخری دھوپ کا دھبّا چمک رہا تھا۔ اس کا سایہ ایک ڈبڈباتی سرخ آنکھ کی طرح دریا کے بیچ چمک جاتا تھا۔

میں نے سوچا، کوئی نہیں جانے گا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ بوڑھا یہاں، اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس خیال سے مجھے اطمینان ہوا کہ میں نے اس سے چھٹکارا پا لیا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ محض گمان ہو، ایک جھوٹا بھٹکاؤ جو اکثر اجنبی شہروں میں گھومتے ہوئے ہو جاتا ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی جب میں اپنے کو نئے سرے سے اکیلا پاؤں گا تو ہر چیز اپنے موزوں اور اصلی دائرے میں لوٹ آئے گی۔

سامنے پُل پر ٹرام جارہی تھی۔ اس کی بتّیوں کا سایہ چمکیلے جھالر کی طرح پانی پر پھسلتا رہا۔ کچھ لوگ کھڑکی سے باہر اس جزیرے کو دیکھ رہے تھے بالکل اسی طرح فطری ڈھنگ سے جیسے میں آر پار جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا، لیکن اب میں کھڑکی سے لٹکے ہوئے ان کے چہروں کو دیکھ کر بے چین ہوگیا۔ اپنے آپ پر شبہ ہونے لگا جیسے یہاں آکر میں نے کوئی غلطی کرڈالی ہو...... مجھے بھی اُن کی طرح پُل کے پار سیدھے چلے جانا چاہیے تھا۔

کوشش کروں تو اَب بھی جاسکتا ہوں صرف......

مجھے اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ دو لڑکے میری طرف بہت دھیمی رفتار سے چلے آرہے تھے۔ اس شہر کے دوسرے لڑکوں کی طرح اُن کے سَر گول اور نیلی ٹوپیوں سے ڈھکے تھے۔ چھوٹے لڑکے کے ہاتھ میں ایک چوڑا رنگ برنگا رومال تھا۔ وہ پیڑوں سے جھڑے ہوئے پیلے اور مرجھائے پتّوں کو اُس رومال میں بٹورتا جارہا تھا۔ بڑا لڑکا — جو پہلے سے قد میں اونچا تھا لیکن عمر میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا، بے دلی سے ایک چھوٹی سی ٹہنی ہوا میں گُھماتا ہوا چل رہا تھا۔ دونوں جزیرے کے آخری کنارے تک آگئے تھے۔ اس جگہ تک جہاں کنارے پر لگی جھاڑیاں پانی میں بھیگ رہی تھیں۔

چھوٹا لڑکا دبے قدموں سے ڈھلان پر اُترا اور اس نے رومال میں بندھے سارے پتّوں کو پانی میں ڈال دیا۔ پھر اُس نے اپنے کوٹ کی دونوں جیبوں سے کچھ اور پتّے نکالے — گیلی مٹّی میں لتھڑے پتّے — اور پھر انھیں بھی دونوں ہاتھوں سے بہتے پانی میں اُس نے بہادیا۔ اس بیچ مجھے محسوس ہوا کہ بڑا لڑکا مجھے دیکھ رہا ہے — اب بھی وہ چھوٹی سی ننگی ٹہنی ہوا میں گھما رہا تھا۔ اس کے دانتوں کے بیچ گھاس کا ایک تنکا تھا جسے وہ برابر چبائے جارہا تھا۔ چھوٹا لڑکا پتّوں کو بہاکر اوپر آگیا۔ دونوں اب ایک ساتھ کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔

ایک نگاہ ہوتی ہے — سیدھی، مستقل اور مستحکم۔ اس میں ہم بندھ جاتے ہیں اور ریل کی طرح کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔ سوئی کی نوک کے نیچے جیسے کوئی کیڑا دب جاتا ہے، بدحواس ہوکر تلملاتا ہے پھر ٹھہر جاتا ہے، حواس باختہ، بے ہوش اور ساکت ...... ویسے ہی، بالکل ویسے ہی۔

پھر بڑا لڑکا آگے بڑھا۔ بڑی سادگی سے وہ میرے نزدیک چلا آیا۔ مجھے محسوس ہوا، اس کا میرے پاس چلا آنا بالکل فطری تھا۔ ایسا لگا کہ پچھلے چند لمحوں سے میں خود اس کے لیے منتظر تھا۔

آج کیسے ہو؟ اس نے پوچھا۔ میں کچھ بھی کہہ پاتا لیکن مجھے محسوس ہوا، پیچھے کھڑا لڑکا بہت ہی نفرت آمیز انداز میں مسکرا رہا ہے۔

’’آج بھی خالی ہاتھ ہو؟‘‘

''خالی ہاتھ؟'' میری آنکھیں اپنے ہاتھوں پر جُھک گئیں۔ وہ سچ مچ خالی تھے۔

''میرا مطلب ان سے نہیں ہے''۔ بڑے لڑکے نے اسی پُر اعتماد اور واضح آواز میں کہا: ''آج بھی تم کچھ نہیں پکڑ پائے؟''

''لیکن تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں، جسے تم تلاش کر رہے ہو۔ وہ تو کب کا چلا گیا۔''

''کہاں؟''

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ جزیرے پر ڈوبتے سورج کی پیلی اور مَیلی سی لالی پھیل گئی تھی۔ دور پُل کے پاس جلتے پتّوں کے ڈھیر سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ صرف ہوا چلنے سے پتّے ٹہنیوں سے لڑھک کر زمین پر گرنے لگے تھے۔

''وہ اب یہاں نہیں ہے''، میں نے کہا لیکن نہ جانے کیوں اس بار میری آواز میں پہلے جیسا استحکام نہیں تھا۔

''لیکن تم تو یہاں ہر روز آتے ہو؟'' چھوٹے لڑکے نے کہا۔ ''اِدھر دیکھو، تمھارے بوٹ کے نشان اب بھی ہیں۔''

میں نے دیکھا، میرے پیر سے قریب، اب بھی وہ نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بھرا بھرا سا، چوڑا اور آگے کی طرف سے ذرا بے ڈول۔ ٹوٹی، اُکھڑی ہوئی گھاس کے بیچ جوتے کی صاف اور سالم چھاپ۔ بدن کے ایک کٹے حصّے کی طرح وہ نشان گیلی زمین سے چپکا رہ گیا تھا۔

''لیکن وہ میرا نہیں ہے۔'' کچھ بے یقینی کے ساتھ کمزور لہجے میں مَیں نے ردِّعمل کا اظہار کیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ دونوں انتظار کر رہے ہیں کہ ثبوت دینے کے لیے اپنے پاؤں آگے بڑھاؤں گا۔ خود میرے لیے یہ بات غیر فطری نہیں تھی لیکن کوئی طاقت مجھے روک رہی تھی۔ میں پوری طاقت سے اپنے پیروں کو لمبی گھاس میں چھپائے کھڑا رہا۔

اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایسا محسوس ہوا کہ ان کی دل چسپی میری ذات میں ختم ہوگئی۔ چھوٹا لڑکا حسبِ سابق اپنے رومال میں نیچے گرے پتّوں کو بٹورتا ہوا دور نکل گیا۔ بڑا لڑکا وہاں کچھ دیر تک کھڑا رہا — میری طرف سے بے فکر اور لاتعلّق۔

میں اچانک چونک گیا۔ وہ اسی جگہ کھڑا تھا جہاں بوڑھا چلتے چلتے چند لمحوں کے لیے ٹھٹھک گیا تھا۔ اسی جگہ اس کی آنکھیں کسی مرکز پر جا ٹِکی تھیں، جہاں بوڑھا اتنی دیر سے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

یہ محض اتّفاق تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں کیوں کہ کچھ دیر بعد ہی اُس نے اپنے پاس پڑے ایک ڈھیلے کو ٹھوکر مار کر پانی میں لڑھکا دیا۔ پانی ہِلا۔ کہیں بہت نیچے بہت سی پرتیں کُھلتی چلی گئیں۔ جھاڑی کے پاس گیلی مٹّی پر رینگتے ہوئے کیڑوں کی قطار لمحہ بھر رُک کر پھر آگے بڑھ چلی۔ اس نے منھ کا تنکا پانی میں تھوک دیا۔ سر سے ٹوپی اُتار کر اُسے ہوا میں ایک دو بار جھٹکا کر اُس نے پہن

© NCERT not to be republished

لیا۔ پھر اسی پُرانے انداز سے ٹہنی کو ہوا میں گھماتا ہوا چھوٹے لڑکے کے پیچھے چل دیا۔

اتنا ہی ہوا۔ دونوں چلے گئے تھے، مجھے اپنے حال پر چھوڑ کر۔ میں پھر وہاں اکیلا چھوٹ گیا لیکن اُن کے جانے کے بعد پہلے جیسا اکیلا پن واپس نہیں آیا۔ جب تک اکیلا پن ساتھ رہتا ہے، صحیح معنوں میں تب ہم اکیلے ہوتے ہیں۔ اب میں صرف اپنے ساتھ تھا اور مجھے یہ خیال خوف ناک لگا کہ وہ دونوں مجھ سے کچھ چھین کر لے گئے ہیں جو اَب تک میرے ساتھ تھا۔

اس کے بعد میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں بیٹھ سکا۔ میں پھر اپنی پُرانی جگہ واپس آ گیا– پیڑ کے تنے کے پاس – جہاں اَب بھی میرا بیگ رکھا تھا۔

شہر کی پہاڑیاں اب اندھیرے میں چھپ گئی تھیں لیکن ان کے اوپر پیچھے کی طرف سے اٹھتے ہوئے گوتھک گرجا کے مینار ایک نیم فراموش خواب کی طرح ہوا میں ٹنگے تھے۔ انھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے ایک لحیم شحیم پرندہ اڑتا ہوا اچانک ٹھٹھک گیا ہو، پہاڑی اور کُھلے آکاش کے درمیان اس کے دونوں پر اوپر کی طرف مڑ گئے ہوں اور پتھرا گئے ہوں خالی ہوا میں۔

جزیرے سے کچھ دور شہر کے پُرانے پُل کی بتّیاں جھجھکتی سی ایک کے بعد ایک جلنے لگی تھیں۔ بہتے پانی میں ان کا سایہ ٹمٹماتی موم بتّیوں کی طرح کانپ جاتا تھا۔

بہتے پانی کو دیکھنا ایک عجیب احساس ہے۔ زیادہ دیر تک ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہو تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے وجود میں سے بھی کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ ہمارے اندر دوری کے جو حصّے ہیں، جنھیں کبھی کبھار سوتے ہوئے نیند کی لہریں بھگو کر واپس لوٹ جاتی ہیں جو ہماری آدھی اندھیری زندگی کا حصہ ہیں۔ لگتا ہے، جیسے وہ سیاہ گہرے پانی کے اندر سے انھیں جھانک رہے ہوں، ہمیں دیکھ رہے ہوں۔

کیا پہلے میں نے کبھی دیکھا ہے— ان دونوں لڑکوں کو، جو ابھی یہاں سے چلے گئے۔ اس شہر میں میں اجنبی ہوں۔ اگر آج رات اچانک میں یہاں سے چلا جاؤں تو ہوٹل کے مینیجر اور پولیس کے علاوہ کسی کو کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ نہیں، یہ صرف میرا گمان ہے۔ انھوں نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی ہے۔ ایسا دھوکا اکثر ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ مذاق کر رہے ہوں۔ بچے اکثر غیر ملکیوں کو دیکھ کر مذاق کرتے ہیں۔

مجھے ذرا سی خوشی ہوئی کہ وہ چلے گئے۔ میں جان بوجھ کر اس خوشی کو چھپاتا رہا جیسے میں اس پر شرمندہ ہوں۔ جزیرے پر صرف جلتے ہوئے پتّوں سے دو چار بجھتی ہوئی لپٹیں اُٹھ جاتی تھیں۔ بچے انھیں اسی طرح جلتا ہوا چھوڑ کر بہت پہلے جا چکے تھے۔ اب چاروں طرف خاموشی تھی— اسی طرح تواتر کے ساتھ، جیسے بہتے پانی کی آواز۔ اس بیچ جزیرہ اور ندی کی سرحد مٹ گئی تھی یا شاید مٹی

نہیں تھی۔ اندھیرے میں پانی کو پہچاننا مشکل تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر ایک ہلکی سفید رقیق لکیر نظر آتی تھی جس پر شام کی ہوا تھی جو کبھی پانی میں پُل کی بتّیوں کو جھکجھوڑ کر آگے کھسک جاتی تھی۔

سردی اچانک بڑھ گئی۔ میں وہاں سے جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میں وہاں بالکل اکیلا نہیں ہوں۔ دائیں جانب، جہاں جھاڑی تھی، ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ پہلے دو دھندلے سائے دکھائی دے رہے تھے، بعد میں انھیں صاف الگ دیکھ پایا۔ لڑکی کے اسکرٹ کا اگلا حصہ شاید جھاڑی میں پھنس گیا تھا۔ اور وہ اسے نکالنے کے لیے نیچے جُھکی تھی۔ شاید جھاڑی کی سرسراہٹ نے ہی میرا دھیان اُن کی طرف کھینچا۔ اُس کے پیچھے جو دوسرا آدمی تھا، اُسے میں پہلی نگاہ میں دیکھ نہیں پایا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ بغیر ہلے ڈلے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس کے لمبے اوور کوٹ نے اندھیرے میں اسے کچھ اس ڈھنگ سے چھپا لیا تھا کہ غور سے دیکھے بغیر اس کے علاحدہ وجود کو پہچاننا ناممکن تھا۔

میں نے سوچا: مجھے وہاں سے چپ چاپ اُٹھ کر چلے جانا چاہیے......

دوسرے دن صبح میں وہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔

(نرمل ورما)

مشق

سوالات

1. نرمل ورما نے سیر و سیاحت کے دوران مسافر کی جن کیفیات کا ذکر کیا ہے، انھیں اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
2. افسانہ نگار نے بوڑھے مچھوارے کی تصویر کشی کس انداز میں کی ہے؟
3. جزیرے کے کنارے اور پُل کے ساتھ غروبِ آفتاب کے جو مناظر نرمل ورما نے پیش کیے ہیں، ان پر تبصرہ کیجیے۔
4. نرمل ورما کے اس افسانے کو مختصراً اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

© NCERT not to be republished

انشائیہ

لفظ انشا اردو میں کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے۔انشائیہ بھی اسی لفظ سے بنا ہے۔محققین کا خیال ہے کہ لفظ Essay عربی لفظ ''السّعی'' سے نکلا ہے جو لفظ انشا کا بدل ہے۔''السّعی'' فرانسیسی میں Essai اور انگریزی میں Essay بنا۔

ابتدا میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری میں زیادہ فرق نہیں تھا،مگر رفتہ رفتہ ان میں فرق پیدا ہوتا گیا، یہاں تک کہ انشائیہ ایک علاحدہ صنف قرار پائی۔انشائیہ نگار اپنے مخصوص ذاتی مشاہدات اور تاثرات کو بے باکی اور بے تکلفی سے بیان کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انشائیہ میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ موضوعات سے متعلق خیال کے تمام مرحلے خوش طبعی کے ساتھ طے کیے جاتے ہیں۔ یہ بات میں بات پیدا کرنے کا فن ہے۔انشائیہ نگار مفہوم سے خالی گفتگو میں بھی معنی پیدا کر دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔اختصار اس کی پہچان ہے۔ اس میں مزاح یا ٹھٹھول کی جگہ ہلکی پھلکی زیرِ لب ہنسی پنہاں ہوتی ہے۔خیال آفرینی اس کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

اردو میں انشائیے کی ابتدا سر سید احمد کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' سے ہوتی ہے۔مولوی نذیر احمد اور ذکاء اللہ کے بعد ''اودھ پنچ'' اور ''مخزن'' نے اسے فروغ دیا۔میر ناصر علی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، پطرس بخاری، سید محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی نے اس صنف کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

پطرس بخاری

1898 تا 1958

ان کا اصلی نام احمد شاہ بخاری تھا۔ اردو ادب میں پطرس کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ پشاور میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں انگریزی کے استاد مقرّر ہوئے۔ اس کے بعد دہلی ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہو کر ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر مامور رہے۔

پطرس بخاری اردو ادب کے معدودے چند لکھنے والوں میں سے ہیں جنھوں نے اگرچہ کم لکھا، لیکن شہرت بہت حاصل کی۔ پطرس کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''مضامینِ پطرس'' کُل گیارہ مضامین پر مشتمل ہے، مگر اس مختصر کتاب میں قہقہوں کی ایک رنگا رنگ دنیا آباد ہے۔ انھوں نے انگریزی ادب کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی تحریر پر انگریزی طرز کی گہری چھاپ ہے۔ ان کی عبارت میں شوخی، شگفتگی، روانی اور بے ساختہ پن نمایاں ہے۔ سیدھی سادی باتوں سے مزاح پیدا کرنا، لفظوں کے اُلٹ پھیر سے جملے چُست کرنا اور خود کو مذاق کا موضوع بنا کر اپنے اوپر ہنسنا ان کا خاص انداز ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچّائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو خوب ہنساتے ہیں۔ ان کی ظرافت نہایت خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔

زیرِ نظر مضمون ''مرحوم کی یاد میں'' پطرس بخاری کا شاہکار ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ایک دوست کی پرانی سائیکل کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس پرانی سائیکل پر سوار ہو کر اپنے سفر کرنے کی روداد اتنے دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ پطرس کے مزاح میں شائستگی اور خوش مذاقی کا انداز بہت نمایاں ہے۔ اپنے فطری مزاح کی وجہ سے پطرس کی تحریریں ہمیشہ شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔

© NCERT not to be republished

5258CH06

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہوجائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں، یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے،لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کررہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹرکار گزر جاتی تھی، میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھتا ہوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد وغبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن گھر میں آکر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے۔ میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آجائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی، آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہوکر بولا۔

”مرزا! ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟“

مرزا صاحب بولے،”بھئی کچھ تو ہوگا نہ آخر!“

میں نے کہا،”میں بتاؤں تمھیں؟“

کہنے لگے”بولو۔“

میں نے کہا،”کوئی فرق نہیں — سنتے ہو مرزا کوئی فرق نہیں، ہم میں اور حیوانوں میں،کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں — ہاں ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو، کہہ دو گے حیوان جُگالی کرتے ہیں،تم نہیں کرتے، ان کے دُم ہوتی ہے تمھارے نہیں ہوتی — لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے

© NCERT not to be republished

افضل ہیں لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں، وہ بھی پیدل چلتے ہیں، میں بھی پیدل چلتا ہوں، اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو — بس چُپ ہو جاؤ، تم کچھ نہیں کہہ سکتے، جب سے میں پیدا ہوا ہوں اسی دن سے پیدل چل رہا ہوں۔

''پیدل —! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے، پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے، یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں، دوسرا اٹھاتا ہوں دوسرا رکھتا ہوں، پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں، تخیّل مرجاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں جو اپنی تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں، یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابلِ توجہ ہی نہیں، یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا اچھا مرزا یوں ہی سہی، دیکھو تو، میں کیا کرتا ہوں۔

میں نے اپنے دانت پچّی کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا، میں مسکرا دیا، لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا:

''مرزا! میں ایک موٹر خریدنے لگا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے۔

''کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟''

میں نے کہا، ''سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ضرورت سے زیادہ ذہین ہو، اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیے تاکہ تمھیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔''

مرزا بولے۔

''ہوں —''

اب کے مرزا نہیں، میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھالیں، پھر سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا بولے۔ ''ہوں۔''

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے، مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے — میں چاہتا ہوں کہ مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہ کہاں تک مرعوب ہوا ہے، لیکن مرزا نے پھر کہا۔

''ہوں۔''

میں نے کہا ''مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر میں دو تین زبانیں سیکھی ہیں اور ان کے علاوہ تمھیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں، جو کسی اسکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے، پھر بھی اس وقت تمھارا کلام ''ہوں'' سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو مرزا۔ اس وقت تمھاری جو ذہنی کیفیت ہے اُسے عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔''

مرزا صاحب کہنے لگے ''نہیں، یہ بات تو نہیں، میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا، تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں، تو میاں خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''وغیرہ'' کا بندبست تو بخوبی ہو جائے گا، لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟''

''یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا۔''

''میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں۔''

مرزا بولے ''کون کون سی۔ مثلاً؟''

میں نے کہا ''ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔''

مرزا کہنے لگے، ''چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں؟ بہت سوچا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں — اِس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے۔

© NCERT not to be republished

’’میں تمھیں ایک ترکیب بتاؤں — ایک بائیسکل لے لو۔‘‘

میں نے کہا’’ وہ روپے کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔‘‘

کہنے لگے’’ مفت۔‘‘

میں نے حیران ہوکر پوچھا’’ مفت — ! وہ کیسے؟‘‘

کہنے لگے’’ مفت ہی سمجھو — آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے، البتّہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔‘‘

ایسے موقعے پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں، اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، اُبلتے ہوئے فوّاروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ چنانچہ جب مجھے یقین ہوگیا کہ یک لخت کوئی خوش خبری سننے سے دل کی حرکت بند ہوجانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں، تو میں نے پوچھا۔

’’ہے کس کی — ؟‘‘

مرزا بولے،’’ میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے وہ تم لے لو۔‘‘

میں نے کہا۔’’ پھر کہنا — پھر کہنا۔‘‘

کہنے لگے۔’’ بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے، جب میری ہے تو تمھاری ہے، تم لے لو۔‘‘

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پانی پانی ہوگیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا دیکھنے میں کہاں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کرلی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا’’ مرزا سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور دُرشتی اور بے ادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں جو ابھی میں نے تمھارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی، دوسرے آج میں تمھارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے میں معاف کردو گے، میں ہمیشہ تم کو از حد کمینہ، مُمسک، خود غَرض اور عیّار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مَت ہو۔ انسان سے غَلَطی ہو ہی جاتی ہے، لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کردیا ہے کہ میں کتنا قابلِ نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں، مجھے معاف کردو۔‘‘

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چُھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھ دیتا لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

''واہ، اس میں میری فیّاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے، جیسے میں سَوار ہوں ویسے تم سوار ہوئے۔''

میں نے کہا، مرزا مفت نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔''

مرزا کہنے لگے ''بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم حسّاس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے — حالاں کہ خدا گواہ ہے — احسان اس میں کوئی نہیں —''

میں نے کہا — ''خیر کچھ بھی سہی، تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔''

مرزا بولے، ''قیمت کا ذکر کر کے گویا تم مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی، وہ بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔''

میں نے پوچھا ''تم نے کتنے میں خریدی تھی؟''

کہنے لگے۔ میں نے پونے دو سو روپے میں خریدی تھی، لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔''

میں نے کہا ''کیا بہت پرانی ہے؟''

بولے، ''نہیں ایسی پُرانی بھی کیا ہوتی، میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے، آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنھیں کالج کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔''

''مگر مرزا، پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس کی آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔''

مرزا کہنے لگے ''تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی ہی مانگتا ہوں — اوّل تو قیمت لینا نہیں چاہتا — لیکن —''

میں نے کہا ''نا مرزا قیمت تو تمھیں لینی پڑے گی — اچھا تم یوں کرو — میں تمھاری جیب میں کچھ روپے ڈالے دیتا ہوں — تم گھر جا کر گن لینا — اگر تمھیں منظور ہو تو کل بائیسکل بھیج دینا — ورنہ روپے واپس کر دینا — اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں — یہ تو کچھ دوکانداری کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔''

مرزا بولے ’’ بھئی جیسی تمھاری مرضی، میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو، لیکن میں جانتا ہوں تم نہ مانو گے۔‘‘

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا — میں نے سوچا، استعمال شدہ چیزوں کی قیمت لوگ عام طور پر آدھی دیتے ہیں — لیکن جب میں نے مرزا سے کہا میں آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا — تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ تو بیچارہ بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو، لیکن مفت میں کیسے لے لوں، آخر بائیسکل ہے، ایک سواری ہے، فٹنوں، گھوڑوں، موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چالیس روپے ہیں، چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں، پینتالیس یا پچاس ہوں جب بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیے جائیں۔ جن رقموں کے آگے صفر آتا ہے، وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں، بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔

خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا، چالیس روپے مُٹھّی میں بند کر کے مرزا کی جیب میں ڈال دیے اور کہا، ’’مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا، لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمھیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔‘‘

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا ’’ مرزا کل صبح ضرور بھجوا دینا۔‘‘ رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک دفعہ پھر کہا۔

’’ کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے — دیر نہ کرنا — خدا حافظ — اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا — خدا حافظ — اور تمھارا بہت بہت شکریہ — میں تمھارا بہت ممنون ہوں — اور میری گستاخی کو معاف کر دینا، دیکھونا کبھی کبھی یوں ہی بے تکلفی میں — کل صبح آٹھ نو بجے تک — ضرور — خدا حافظ —‘‘

مرزا کہنے لگے ’’ ہاں ہاں، وہ سب کچھ ہو جائے گا۔‘‘

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اِرد گِرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سِرے سے دیکھ ڈالوں گا اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا، صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا اور شام کو ٹھنڈی سڑک پر جب اور لوگ سیر کو نکلیں گے، میں بھی سڑک کی صاف شفّاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی طرح گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی جب بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اُڑ رہا ہو وہ مسکراہٹ جس کا ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، بارہا دل چاہا کہ بھاگ کر جاؤں — اور اسی وقت مرزا کو گلے سے لگا لوں۔ رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر

رضامند ہوجائے۔ صبح اٹھتے ہی نوکر نے خوشخبری سُنائی کہ حضور، وہ بائیسکل آ گئی ہے۔

میں نے کہا ’’ اتنے سویرے؟‘‘

نوکر نے کہا ’’ وہ تو رات ہی آ گئی تھی۔ آپ سو گئے تھے، میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈِبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔‘‘

میں حیران ہوا کہ مرزا صاحب نے بائیسکل بھجوانے میں اتنی عجلت کیوں کی — لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں، روپے لے لیے تھے تو سائیکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا ’’ دیکھو یہ اَوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو، بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھّی طرح جھاڑ لو اور یہ موڑ پر جو بائیسکل والا بیٹھتا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو اب بھاگا کہاں جاتا ہے، ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کُپّی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے جس سے تمام پرزے خراب ہو جائیں، بائیسکل کے پُرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جارہے ہیں اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی نہ رگڑنا بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے‘‘۔ ذرا جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ، ’’چل چنبیلی باغ میں‘‘ گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔ برآمدے میں آیا تو ایک عجیب وغریب مشین پر نظر پڑی، ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا ’’ کیوں بے! یہ کیا چیز ہے؟‘‘

نوکر بولا ’’ حضور یہ بائیسکل ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’ بائیسکل! کس کی بائیسکل؟‘‘

کہنے لگا ’’ مرزا صاحب نے آپ کے لیے بھجوائی ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’ اور جو سائیکل رات کو انھوں نے بھجوائی تھی وہ کہاں گئی؟‘‘

کہنے لگا ’’ یہی تو ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’ کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟‘‘

کہنے لگا ’’ جی ہاں —‘‘

میں نے کہا ’’ اچھا —‘‘ اور پھر اُسے دیکھنے لگا۔

© NCERT not to be republished

''اِس کو صاف کیوں نہیں کیا؟''

''حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔''

''تو یہ میلی کیوں ہے؟''

نوکر نے اِس کا جواب دینا شاید مناسب خیال نہ کیا۔

''اور تیل لایا؟''

''ہاں حضور لایا ہوں۔''

''دیا؟''

''حضور وہ تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔''

''کیا وجہ—؟''

''حضور دُھروں میں مَیل اور زنگ جما ہے، وہ سوراخ کہیں بیچ میں ہی دب دبا گئے ہیں۔''

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا، اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہوگیا کہ بائیسکل ہے، لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل، رَہَٹ، چرخہ اور اسی طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پھر پہیے کو گھما گھما کر سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سلسلۂ آمد و رفت بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا۔

’’حضور وہ تیل تو سب اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے، بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔‘‘

میں نے کہا، ’’اچھا اوپر ہی اوپر ڈال دو، یہ بھی مفید ہوتا ہے۔‘‘

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا، پہلا ہی پاؤں چلایا تو معلوم ہوا کہ جیسے کوئی مردہ ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو— گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اُترائی تھی، اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے کہ جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصّوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونا شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں، چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدّی کے نیچے اور پچھلے پہیّے سے نکلتی تھیں ......کھٹ، کھڑ، کھڑڑ کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر، چرخ، چر، چرخ قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھالی تھی۔ جب کبھی میں پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوجاتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہوجاتی تھی۔ پچھلا پہیّا گھومنے کے علاوہ جھومتا تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو بھی نشان بن جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔

مڈگارڈ تھے تو سہی، لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے، ان کی مدد سے صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔

اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا، جس کی وجہ سے پہیّہ ہر چکر میں ایک دفعہ قدرے زمین سے اوپر کو اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکّے مارے جا رہا ہو، پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں، پھٹ پھٹ، چوں چوں کی صدائیں نکل رہی تھیں۔ جب اُتار پر سائیکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اَب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ چونکے، ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیّوں کی آواز جُدا سنائی دے رہی تھی لیکن چوں کہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ پھٹ، چوں چوں پَھٹ پَھٹ کی آواز نے اب چچوں پَھٹ چچوں پَھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی اَدق افریقی زبان کی گردانیں دُہرا رہی تھی۔

اِس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبعِ نازک پر گراں گزری، چنانچہ اس میں یک لخط دو تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جاتا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدّی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے کو بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے ٹھوڑی

© NCERT not to be republished

تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیوں کی اٹھکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدّی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دِہ ثابت ہوا، اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کرلوں، چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرالیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل اسٹیشن سے باہر آیا ہوں۔ جیب کے اندر سے میں نے اَوزار نکالا۔ گدّی کو اونچا کیا کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا، اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی، میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔ آپ میری حالت کا تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو، مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے لیے میری حالت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو۔ ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد گدّی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا ''دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟'' گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدّی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرے جسم دونوں

برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدّی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا، لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اُٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو میں نے فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہییں، چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑ کھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا، ''ذرا اس کی مرمّت کر دیجیے۔''

ایک مستری آگے بڑھا، لوہے کی سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اُس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھونک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا، اُس نے بڑی تیزی سے حالات کا اندازہ لگا لیا ہے، لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا ''کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا۔''

میں نے کہا۔ ''بڑے گستاخ ہو تم، دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدّی کو اونچا کروا کے کسوانا ہے، بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟''

مستری کہنے لگا۔ ''مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں وہ بھی ٹھیک کر دو۔''

کہنے لگا۔ ''اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لو تو اچھا ہے۔''

میں نے کہا ''اچھا کر دو۔''

بولا ''یوں تھوڑا ہی ہو سکتا ہے، دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔''

''اور پیسے کتنے ہوں گے؟''

کہنے لگا۔ ''بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔''

میں نے کہا ''بس جی، جو کام تم سے کہا ہے وہ کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔''

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدّی پھر اونچی کر کے کس دی گئی، میں چلنے لگا تو مستری نے کہا ''میں نے تو کس دیا ہے لیکن پیچ سب گھِسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب ڈھیلے پڑ جائیں گے۔''

میں نے کہا ''بدتمیز کہیں کا۔ دو آنے مفت میں لے لیے۔''

© NCERT not to be republished

بولا’’ جناب آپ کو یہ بائیسکل بھی مفت میں ملی ہوگی، آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟‘‘ للّو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے، پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔‘‘

میں نے کہا’’ واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے۔ ان کو ابھی کالج چھوڑے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے۔‘‘

مستری نے کہا’’ ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔‘‘

میری طبیعت یہ سُن کر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا، لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹّھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لیے ٹانگوں، کندھوں، کمر اور بازوؤں میں اس قدر درد ہو رہا تھا جو برداشت کے قابل نہ تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا، لیکن میں ہر بار کوشش کرکے اس کو دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ مُنعَقِد کرتا جس میں مرزا کی مکّاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کُل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چِتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اَونے پَونے بیچ کر جو وصول ہو اُسی پر صبر و شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ ہی سہی چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی، وہاں ٹھہر گیا۔

دکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا، لیکن میری زبان کو جیسے قُفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں، آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامّل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ’’ یہ بائیسکل ہے۔‘‘

دکان دار کہنے لگا’’ پھر؟‘‘

میں نے کہا’’ لوگے؟‘‘

کہنے لگا’’ کیا مطلب؟‘‘

میں نے کہا’’ بیچتے ہیں ہم۔‘‘

دکان دار نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا— پھر

© NCERT not to be republished

مجھے دیکھا— پھر بائیسکل کو دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کرسکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے، آخر کار بولا:

''کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر—؟''

ایسے سوالات کا جواب خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا ''کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے اُن کا مصرف کیا ہوگا؟''

کہنے لگا ''وہ تو ٹھیک ہے، مگر کوئی اس کو لے کر کیا کرے گا۔''

میں نے کہا ''اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟''

کہنے لگا— ''اچھا چڑھ گیا پھر—؟''

میں نے کہا ''پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟''

دکان دار بولا ''اچھا، ہوں— خدا بخش ذرا یہاں آنا، یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔''

جن حضرت کا نام خدا بخش تھا، انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے دیکھا، جیسے بو سونگھ رہے ہوں۔

اِس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا، میرے پاس آئے اور کہنے لگے ''تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟''

میں نے کہا ''تو اور کیا۔ محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟''

کہنے لگا ''تو کیا لیں گے آپ؟''

میں نے کہا ''تم ہی بتاؤ؟''

کہنے لگا ''سچ مچ بتاؤں؟''

میں نے کہا ''ہاں۔''

پھر کہنے لگا ''سچ مچ بتاؤں؟''

میں نے کہا ''اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے۔''

کہنے لگا ''تین روپے دوں گا اس کے۔''

میرا خون کھول اُٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا۔

''او صَنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے انسان! مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس

© NCERT not to be republished

بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کرسکتا۔'' یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہوگیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اُچھل کر مجھ سے آ لگی اور آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور اِدھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ جب حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلّفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدّت سے مجھے جس بات کا شوق تھا آج پورا ہوگیا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے، جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت وشنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد وپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیا بالکل الگ ہوکر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا، جو پہیّا الگ ہوگیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ سائیکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تمھارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کا ہے کو لے جا رہے ہو؟''

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو سب لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ، جو ہنس رہے ہیں انھیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں، آخر ہوا کیا۔ محض ایک حادثہ، بس دائیں بائیں مت دیکھو، چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے، ایک آواز آئی ''بس حضرت غصّہ تھوک ڈالیے۔'' ایک دوسرے صاحب بولے ''بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کر تجھے مزہ چکھاؤں گا۔'' ایک بزرگوار اپنے لختِ جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے، میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ''دیکھو بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے علاحدہ ہوتے ہیں'' لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کش مکش میں مبتلا تھا، پیچ وتاب کھا رہا تھا اب بہت ہلکا ہوگیا تھا، میں برابر چلتا گیا، حتیٰ کہ ایک دریا پر جا پہنچا۔ پُل کے اُوپر کھڑے ہوکر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہوگیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا مرزا بولے ''اندر آجاؤ۔''

میں نے کہا ''آپ ذرا باہر تشریف لائیے، میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وُضو کیے بغیر کیسے داخل ہوسکتا ہوں؟''
مرزا صاحب باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزاران کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ ہی مفت میں مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا۔

''مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے، میں اب اِس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔''

گھر پہنچ کر میں نے پھر علمِ کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف۔ اے کے کورس میں پڑھی تھی۔

(پطرس بخاری)

مشق

سوالات

1. اس سبق میں مرحوم کسے کہا گیا ہے؟
2. موٹر کو دیکھ کر مصنّف کو کیا خیال آیا اور وہ کیا سوچنے لگا؟
3. مصنّف نے بائیسکل کو دریا میں کیوں پھینک دیا؟
4. گھر پہنچ کر مصنّف نے کس کتاب کا مطالعہ کیا اور کیوں؟

© NCERT not to be republished